قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا اٹھہترواں سال

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

ستمبر 2021ء

"لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ" (الحدیث) حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے



علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ



ایہہ پُتر ہٹاں تے نئیں وکدے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرویز صاحب کے علمی اسلوبِ تحقیق کی تائید

قرآنی نظریات کی روشنی میں مغرب کے غلط تصورات کی تردید میں محترم پرویز اور ہمارے ہاں کے مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے ڈاکٹر علامہ اقبالؒ، ڈاکٹر رفیع الدین احمد اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی تصنیفات سے چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔ جب بھی قارئین ان اقتباسات کی روشنی میں محترم پرویز صاحب کی تصنیفات کا جائزہ لیں گے تو وہ ان تمام خوبیوں کو بشمول دیگر خوبیوں کے ان میں پائیں گے۔ اس موضوع پر محترم پرویز صاحب کا موقف جاننے کے لئے خصوصی طور پر ان کی تصانیف ''انسان نے کیا سوچا'' اور ''اسلام کیا ہے'' ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہیں۔

(1) ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کا موقف:

1- عقل اور وحی میں تصادم نہیں بلکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

2- قرآن سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ:

(الف) اپنے زمانوں کے تقاضوں اور اپنے دور کی فکری کاوشوں سے متعارف ہوں۔

(ب) قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریفِ آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثرانداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔

(2) ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا موقف:

مغرب کے غلط فلسفیانہ تصورات کی تردید قرآنی نظریات سے کرتے ہوئے مصنف کے لئے ضروری ہے کہ:

1- وہ روحِ قرآن کے ساتھ پوری پوری واقفیت پیدا کریں جس کے بغیر قرآنی اور غیر قرآنی تصورات میں تمیز کرنا مشکل ہوگا۔

2- وہ مغرب کے غلط تصورات کے اصل ماخذ اور ان کے متبعین کے طرزِ خیال و عمل سے پوری پوری واقفیت پیدا کریں۔

3- وہ علم کے تمام شعبوں سے یعنی مادی، حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم اور فلسفہ سے جو ان علوم کو جمع کر کے ایک مکمل نظریہ کائنات ترتیب دیتا ہے، اس حد تک واقف ہوں کہ ان کی ساری وسعت میں جہاں کہیں کوئی اسلامی تصور موجود ہو اسے پہچان کر لے سکیں اور استخراج اور استنباط سے مزید صحیح اسلامی تصورات کو اخذ کر سکیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

ستمبر2021ء

جلد 74 | شمارہ نمبر 9

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: محترم وزیر اعظم سے	ادارہ	4
کیا قائداعظم پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟	پرویزؒ	5
اسوۂ حسنہ (مسلسل)	شیخ اللہ دتا ایڈووکیٹ، لاہور	16
ایہہ پُتر ہٹاں تے نئیں وکدے	بریگیڈیئر اعزاز الدین احمد خان	25
بچوں کا صفحہ: پرویزؒ کا پیغام بچوں کے نام	محمد ارشد، سلیم اختر	34
قانون سے استثناء	خواجہ ازہر عباس، کراچی	38
دوقومی نظریہ پاکستان والی اسلامی مملکت میں انسانی ذات کا ارتقاء	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	44

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50 روپے فی پرچہ

پاکستان: 600 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

ENGLISH SECTION

The world is desperate for Prophet's (PBUH) revolutionary system By G. A. Parwez (Translated by: Mansoor Alam)	56

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)

Phone: 042-35714546

idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو، بے بال و پر نکلے
ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے

ہوئے مدفونِ دریا زیر دریا تیرنے والے
طمانچے موج کے کھاتے تھے جو، بن کر گہر نکلے

غبارِ رہ گزر ہیں، کیمیا پر ناز تھا جن کو
جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو، اکسیر گر نکلے

ہمارا نرم رو قاصد پیامِ زندگی لایا
خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بے خبر نکلے

حرم رسوا ہوا پیرِ حرم کی کم نگاہی سے
جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے

زمیں سے نوریانِ آسماں پرواز کہتے تھے
یہ خاکی زندہ تر، پائندہ تر، تابندہ تر نکلے

جہاں میں اہل ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے، اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

محترم وزیراعظم سے

ہم نے طلوع اسلام کی کسی سابقہ اشاعت میں لکھا تھا کہ حکومت کے مقصود و منتہٰی کے متعلق تفصیلی گفتگو کی جائے تو اس کے لئے ایک ضخیم کتاب بھی ناکافی ہوگی لیکن اگر ان تفاصیل کو سمٹا کر مختصر کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ حکومت سے مقصود یہ ہے کہ ملک کے باشندے اطمینان اور خوش حالی کی زندگی بسر کر سکیں اس نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آ جاتی ہے کہ پاکستان میں جتنی حکومتیں بھی قائم ہوئیں' سب اپنے مقصود میں ناکام رہی ہیں۔ ملک کے باشندوں کو نہ اطمینان نصیب ہوا نہ خوش حالی۔ بلکہ' اس کے برعکس' ان کی بے اطمینانی اور بدحالی میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس افسوسناک صورتِ حالات کے وجوہ و اسباب متعدد ہیں لیکن اس کے بنیادی اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ ہے کہ حکومت کے دفاتر کی مشینری اس ڈھب سے چل رہی ہے کہ جو بدنصیب اس کے چکر میں پھنس جاتا ہے' وہ اپنی قسمت کو روتا ہے۔ وہاں قاعدہ اور قانون کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لوگوں کو تنگ اتنا کیا جاتا ہے کہ اچھے اچھے اصول پرست بھی ان کے تقاضوں کو پورا کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ تاخیر کا یہ عالم ہے کہ اس نے پرانی دیسی ریاستوں کی مضحکہ انگیز کہانیوں کو مات کر دیا ہے۔ ان دفاتر کے ہاتھوں ایک دنیا چیخ رہی ہے' لیکن کوئی کسی کی سنتا ہی نہیں۔ دفاتروں ہی کا ایک شعبہ عدالتوں کو سمجھئے۔ ان میں کسی کو انصاف کی توقع نہیں رہی۔ ہر طرف دھاندلی ہے اور رشوت۔ اس کا نتیجہ یہی نہیں کہ لوگ بے اطمینان اور بدحال ہو رہے ہیں بلکہ ان کے دل سے قانون کا احترام اور حکومت کا وقار اٹھ گیا ہے۔

آپ کے برسر اقتدار آنے سے یہ امید قائم ہوئی تھی کہ آپ اس مشینری کو ڈھب پر لے آئیں گے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آپ دوسرے کاموں میں اس قدر مصروف ہیں کہ آپ کو اس طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ جن کاموں میں آپ مصروف ہیں' ان کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں' لیکن ایسا کہنے میں کچھ مبالغہ نہیں ہوگا کہ اگر وہ سب کام ٹھکانے بھی لگ جائیں لیکن دفاتری اور عدالتی نظم و نسق بد سے بدتر ہوتا جائے تو ایسی حکومت کبھی کامیاب حکومت نہیں کہلا سکے گی۔ ہماری آپ سے باادب گزارش ہے کہ آپ دیگر امور حکومت کو اس طرح بانٹ دیجئے کہ آپ کو اس اہم شعبہ کی دیکھ بھال کے لئے کافی وقت مل سکے۔ اگر آپ کے زمانۂ حکومت میں دفتری اور عدالتی مشینری صحیح خطوط پر چل پڑی تو سمجھ لیجئے کہ آپ نے استحکام پاکستان اور فلاح و بہبود عوام کے لئے ایک نمایاں خدمت سرانجام دے دی۔ آپ کے حسنِ تدبر کا یہی ٹیسٹ ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(گذشتہ سے پیوستہ)

کیا قائداعظم پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟

(سردار شوکت حیات کو غلط فہمی ہوئی ہے)

مفکرِ قرآن علامہ غلام احمد پرویزؒ کی زندگی کا آخری مضمون جو پریس میڈیا میں شائع ہوا

11 اگست 1947ء کی تقریر:

اب آیئے قائداعظمؒ کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کی طرف، جسے یہ حضرات ترپ کے پتے کے طور پر استعمال کیا کرتے ہیں اور جس پر محترم جسٹس محمد منیر مرحوم نے بھی اپنے دعویٰ کی بنیاد رکھی تھی اور اتنا کہنے پر ہی اکتفا نہیں کیا کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے بلکہ یہاں تک کہنے میں بھی کچھ باک نہیں سمجھا کہ انہوں نے دوقومی نظریہ کو بھی ختم کر دیا تھا۔ یعنی اتنا ہی نہیں کہ انہوں نے اسلامی مملکت کے تصور کی نفی کر دی تھی، بلکہ سرے سے اس بنیاد ہی کو منہدم کر دیا تھا جس پر تقسیم ہند کی عمارت استوار ہوئی تھی۔ اس تقریر کے سلسلہ میں بات یوں ہوئی کہ جب قائداعظمؒ کو پاکستان کی پہلی مجلس آئین ساز اسمبلی کا صدر منتخب کیا گیا تو انہوں نے (11 اگست 1947ء کو) اس مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے ایک تقریر فرمائی۔ اس میں انہوں نے پہلے، قبل از تقسیم کے ہندوستان کے کوائف وحوادث پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ وہاں ہندوؤں اور مسلمانوں میں کس قدر باہمی عداوت کی آگ بھڑکتی رہتی ہے۔ وہاں مسلمان اقلیت میں تھے اور ہندو اکثریت میں، اس لئے وہاں ہمیشہ مسلمانوں کا خون خرابہ ہوتا تھا۔ پاکستان میں صورت حال اس کے برعکس ہوگی۔ یہاں مسلمان اکثریت میں ہوں گے اور ہندو اقلیت میں، اس لئے ہندوؤں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ اب یہاں ان کے ساتھ وہی کچھ ہوگا جو کچھ وہ وہاں مسلمانوں کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ ویسے بھی ہندو مورخوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے دور حکومت کا ایسا بھیانک اور دہشت انگیز نقشہ کھینچ رکھا

> بنابریں یہاں کا ہندو اس لئے بھی خائف ہو سکتا تھا کہ اب یہاں جو مسلمانوں کی حکومت قائم ہو رہی ہے تو ماضی کی تاریخ کو یہاں بھی دہرایا جائے گا۔ ہم ہندوستان ٹائمز کا اقتباس پہلے درج کر چکے ہیں جس میں اس نے کہا تھا کہ پاکستان کے ہندوؤں کے دل میں یہی خطرہ لاحق تھا۔

ہے جس سے ہندو عوام خوف و ہراس سے کانپ اٹھتے ہیں۔

بنابریں یہاں کا ہندو اس لئے بھی خائف ہوسکتا تھا کہ اب یہاں جو مسلمانوں کی حکومت قائم ہو رہی ہے تو ماضی کی تاریخ کو یہاں بھی دہرایا جائے گا۔ ہم ہندوستان ٹائمز کا اقتباس پہلے درج کر چکے ہیں جس میں اس نے کہا تھا کہ پاکستان کے ہندوؤں کے دل میں یہی خطرہ لاحق تھا۔ ان تاثرات کو سامنے رکھتے ہوئے قائداعظمؒ نے اپنی اس تقریر میں ہندوؤں کو یقین دلایا تھا کہ پاکستان میں ایسا نہیں ہوگا۔ انہوں نے جملہ تمام اہل پاکستان کو مخاطب کر کے فرمایا:

> تم آزاد ہو، تمہیں اس امر کی کامل آزادی ہے کہ تم اپنے مندروں میں جاؤ یا مسجدوں میں، یا مملکت پاکستان میں کسی اور پرستش گاہ میں، تمہاری ذات یا مسلک کچھ بھی ہو، اس کا امور مملکت سے کچھ تعلق نہ ہو گا۔
>
> اس کے بعد انہوں نے کہا (اور تو اور) انگلستان کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ وہاں عیسائیوں ہی کے دو فرقوں..... رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ..... میں کس قدر کشت وخون ہوا کرتا تھا لیکن اس مملکت نے، اپنی کامل ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے، رفتہ رفتہ ان مناقشات کو مٹا دیا اور ''اب تم پورے انصاف سے کہہ سکتے ہو کہ وہاں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ نہیں، بلکہ ایک مملکت کے شہری بستے ہیں۔''

اگر قائداعظمؒ کہیں مریخ سے ٹپکے ہوتے اور انہوں نے پہلے پہل یہ الفاظ کہے ہوتے تو اس تقریر سے اس قسم کے استنباط کا شائبہ ہوسکتا تھا۔ لیکن جس شخصیت کی دس سالہ (تحریک پاکستان کی) زندگی اور اس دوران میں اس کے صدہا صفحات پر مشتمل بیانات، تقاریر، خطابات ہمارے سامنے ہوں، اس کی طرف ان نتائج کو منسوب کرنا جس قدر زیادتی ہے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اسی طرح.....

> میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اپنے سامنے یہ نصب العین رکھنا چاہئے کہ ایک وقت کے بعد یہاں نہ ہندو، ہندو رہے گا، نہ مسلمان، مسلمان..... مذہبی نقطہ نگاہ سے نہیں، کیونکہ وہ تو ہر فرد کے ذاتی عقیدہ کا سوال ہے۔ ایسا، ان سب کے پاکستان کے شہری ہونے کی حیثیت سے، سیاسی نقطہ نگاہ سے ہوگا۔

یہ ہیں قائداعظمؒ کے وہ الفاظ جنہیں سپر بنا کر یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے تشکیل پاکستان کے فوری بعد دو قومی نظریہ کو بھی خیر باد کہہ دیا تھا اور اسلامی مملکت کے تصور کی تردید کر کے اسے سیکولر بنانے کا اعلان کر دیا تھا۔ اگر قائداعظمؒ کہیں مریخ سے

ٹپکے ہوتے اور انہوں نے پہلے پہل یہ الفاظ کہے ہوتے تو اس تقریر سے اس قسم کے استنباط کا شائبہ ہوسکتا تھا۔ لیکن جس شخصیت کی دس سالہ (تحریک پاکستان کی) زندگی اور اس دوران میں اس کے صدہا صفحات پر مشتمل بیانات، تقاریر، خطابات ہمارے سامنے ہوں، اس کی طرف ان نتائج کو منسوب کرنا جس قدر زیادتی ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جب ان لوگوں سے اس دلیل کا جواب نہیں بن پڑتا تو وہ (نہایت دیدہ دلیری سے) کہہ دیتے ہیں کہ بے شک قائداعظمؒ دس سال تک یہ دعویٰ کرتے رہے لیکن وہ درحقیقت ایک وکیلانہ حربہ تھا جسے انہوں نے اپنا مقدمہ جیتنے کے لئے اختیار کیا تھا۔ جب کیس کا فیصلہ ان کے حق میں ہو گیا تو اس حربہ کی ضرورت نہ رہی۔ ایسا کہنے والے اتنا بھی نہیں سوچتے کہ یہ کچھ وہ کس شخص کے متعلق کہہ رہے ہیں؟ ہم بر بنائے عقیدت نہیں کہتے، بلکہ یہ حقیقت ہے کہ جو شخص قائداعظمؒ کے کیریکٹر کے متعلق کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے، وہ ان کے خلاف اس قسم کا الزام عائد کرنے کی جرأت کبھی نہیں کر سکتا۔ حق گوئی اور بے باکی ان کے کردار کی ایسی خصوصیت تھی جس کا اعتراف ان کے دشمنوں تک کو تھا۔ لندن ٹائمز نے ان کی وفات پر لکھا تھا:

> ضروری تھا کہ یہاں غیر مسلم اقلیتوں کو پورا پورا یقین دلایا جائے کہ وہ یہاں ہر طرح سے محفوظ رہیں گی اور مذہب کی بنا پر ان سے کوئی ناروا سلوک نہیں کیا جائے گا۔ یہ تھے وہ حالات جن میں قائداعظمؒ کو پاکستان میں اپنی پہلی تقریر کرنی پڑی۔

> قائداعظمؒ نے اپنی ذات کو ایک بہترین نمونہ کے طور پر پیش کر کے اپنے اس دعویٰ کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ان میں وہ لچک نہیں تھی جو انگریزوں کے نزدیک، ہندوستانیوں کا خاصہ ہے، ان کے تمام خیالات ہیرے کی طرح قیمتی مگر سخت، واضح اور شفاف ہوتے تھے۔ ان کے دلائل میں ہندو لیڈروں جیسی حیلہ سازی نہیں تھی۔

قائداعظمؒ کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ انہوں نے جب مجلس آئین ساز سے خطاب کیا تھا تو ملک کے حالات کیا تھے۔ تقسیم ہند کے ساتھ ہی ہندوستان میں ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں، مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا تھا۔ اس سے وہاں کے مسلمانوں کے دل میں خوف و دہشت کے ایسے جذبات ابھرے کہ انہوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ پاکستان میں آ کر پناہ لے لیں لیکن ان وحشی درندوں نے ان نہتے قافلوں کو بھی نہ چھوڑا۔ راستہ بھر قتل و غارت گری کی وارداتیں ہوتی رہیں۔ ان کی نوجوان لڑکیوں کو ہزاروں کی تعداد میں چھین جھپٹ کر لے گئے۔ ان کے معصوم بچوں کو نیزوں کی انیوں پر اچھالا گیا اور تو اور، دلی سے جو گاڑیاں خود حکومت کے عملہ کو لے کر روانہ ہوئیں۔ (میں بھی انہیں میں شامل تھا) یہاں پہنچنے پر ان میں سے زندہ انسانوں کی بجائے لاشوں کے ٹکڑے برآمد

ہوئے۔ ظاہر ہے کہ ان وحشیانہ مظالم کا ردعمل پاکستان کے بعض حصوں میں بھی ہوا اور اس سے یہاں کے غیر مسلم باشندوں (بالخصوص ہندوؤں) کے دل میں خوف و ہراس، بے اعتمادی اور بے چینی کے وساوس پیدا ہوئے۔ آپ سوچئے کہ ایک ایسی مملکت جس کی عمر ابھی ایک دن کی بھی نہ ہوئی ہو، اس قسم کے لرزہ خیز حالات سے دوچار ہو۔ پھر اس کی کیفیت یہ ہو کہ اس کے پاس (ابھی) نہ اپنی فوج ہو، نہ اسلحہ، نہ سامان ہو، نہ پیسہ، تو اس کے سربراہ کے دل پر اس سے کیا نہ گزرتی ہو گی؟ اس کے ساتھ اسے بھی ذہن میں رکھئے کہ پاکستان کے اندر خود ایسے عناصر موجود تھے جو ایک طرف یہاں کے غیر مسلموں کے دل میں خوف و ہراس پیدا کر رہے تھے، اور دوسری طرف انہیں اشتعال بھی دلا رہے تھے۔

وہ غیر مسلموں کو یقین دلانا چاہتے تھے کہ انہیں یہاں اسی قسم کی حفاظت ملے گی جیسی مسلمانوں کو۔ انہوں نے اپنی تقریر میں جو کچھ کہا تھا اس سے ان کا مقصد یہی تھا۔

ہندوستان کے اخبارات یہاں کی غیر مسلم اقلیتوں کے خلاف مظالم کی فرضی داستانیں بیان کر کے وہاں کے مسلمانوں کے خلاف انتقام کی آگ کو تیز سے تیز کرتے چلے جا رہے تھے۔ اس کے لئے نہایت ضروری تھا کہ یہاں غیر مسلم اقلیتوں کو پورا پورا یقین دلایا جائے کہ وہ یہاں ہر طرح سے محفوظ رہیں گی اور مذہب کی بنا پر ان سے کوئی ناروا سلوک نہیں کیا جائے گا۔ یہ تھے وہ حالات جن میں قائداعظمؒ کو پاکستان میں اپنی پہلی تقریر کرنی پڑی۔ قائداعظمؒ بڑی متوان شخصیت کے حامل تھے۔ وہ عام طور پر جذبات سے مغلوب نہیں ہوا کرتے تھے لیکن جن حالات سے اس وقت ملک دوچار تھا اور اتنی عظیم ذمہ داریوں کا بوجھ اس مملکت پر آ پڑا تھا، اس کے سربراہ کا ان سے متاثر ہو جانا کوئی غیر فطری امر نہیں تھا۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے وہ غیر مسلموں کو یقین دلانا چاہتے تھے کہ انہیں یہاں اسی قسم کی حفاظت ملے گی جیسی مسلمانوں کو۔ انہوں نے اپنی تقریر میں جو کچھ کہا تھا اس سے ان کا مقصد یہی تھا۔ لیکن (ہمیں اعتراف ہے کہ وہ اپنے معمول کے خلاف) شدت جذبات میں الفاظ کے انتخاب میں کما حقہٗ احتیاط نہ برت سکے۔ بایں ہمہ ان الفاظ سے یہ مستنبط کرنا کہ جس نظریہ کی رو سے انہوں نے دس سال تک ہندو اور انگریز سے جنگ کر کے پاکستان حاصل کیا تھا وہ اسے پہلے ہی دن نذر آتش کر دیں گے، بڑی زیادتی ہے کوئی باہوش انسان اسے باور نہیں کرے گا۔

آیئے ہم لگے ہاتھوں یہ بھی دیکھیں کہ قائداعظمؒ کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کا مفہوم خود غیر مسلم اقلیتیں کیا سمجھتی تھیں۔ کیا انہوں نے یہ سمجھا کہ اس سے قائداعظمؒ مسلمانوں اور غیر مسلموں کی متحدہ قومیت کا اعلان کر کے سیکولر سٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے، یا یہ کہ اس سے مقصود غیر مسلم اقلیتوں کا تحفظ تھا؟ مسٹر جوشوا فضل الدین ایک مشہور مسیحی لیڈر تھے۔ (ان کا چند سال پہلے ادھر انتقال ہوا ہے) جب صدر ایوب (مرحوم) نے لا کمیشن کا تقرر کیا تو مسٹر جوشوا نے اس سوال پر بحث کی تھی کہ مجوزہ آئین کی بنیاد

کیا ہونی چاہئے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ایک پمفلٹ شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا۔ (Rationale of Pakistan Constitution) اس میں انہوں نے پہلے یہ واضح کیا تھا کہ 1940ء کی قرارداد پاکستان کی رو سے مملکت پاکستان کے دو بنیادی ستون ہیں، یعنی (1) مملکت پاکستان کی بنیاد مذہب پر ہوگی۔ یہی وہ قدر مشترک ہے جو مشرقی اور مغربی بازوؤں میں وحدت پیدا کرنے کا موجب بن سکتی ہے..... اور (2) اقلیتوں کے لئے تحفظات۔

اقلیتوں کے لئے تحفظات:

اس کے بعد مسٹر جوشوا نے کہا تھا کہ مجوزہ آئین کو یہ دونوں شرائط پوری کرنی چاہئیں۔ اس کے بعد انہوں نے قائداعظمؒ کی 11 اگست 1947ء (اور اس کے ساتھ 14 اگست 1947ء) کی تقریر کے اقتباسات دے کر یہ کہا تھا کہ ان کی تعبیر میں انتہا پسندانہ رویہ اختیار کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قائداعظمؒ کا مقصد یہ تھا کہ یہاں نہ ہندو، ہندو رہے، نہ مسلمان مسلمان، بلکہ دونوں کے امتزاج سے ایک متحدہ قوم متشکل ہو، جس کا لازمی نتیجہ سیکولر انداز حکومت ہو جائے، وہ بڑی غلطی کرتے ہیں۔ مسٹر جوشوا نے ان لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:

> یہ کہنا کہ تخلیق پاکستان کے بعد قائداعظمؒ نے..... جو خود اس پاکستان کے خالق تھے..... اپنی پہلی ہی تقریر میں کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جس سے اس بات کا دور کا بھی امکان ہے کہ اس سے پاکستان کی بنیاد ہی منہدم ہو جائے گی، بالکل پاگل پن ہے۔ قائداعظمؒ نے اتنا ہی کہا تھا کہ پاکستان میں بلا لحاظ مذہب وملت ہر ایک کو مساوی حقوق شہریت حاصل ہوں گے۔

یہ کہنا کہ تخلیق پاکستان کے بعد قائداعظمؒ نے..... جو خود اس پاکستان کے خالق تھے..... اپنی پہلی ہی تقریر میں کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جس سے اس بات کا دور کا بھی امکان ہے کہ اس سے پاکستان کی بنیاد ہی منہدم ہو جائے گی، بالکل پاگل پن ہے۔ قائداعظمؒ نے اتنا ہی کہا تھا کہ پاکستان میں بلا لحاظ مذہب وملت ہر ایک کو مساوی حقوق شہریت حاصل ہوں گے۔ (مسٹر جوشوا فضل الدین)

اگست 1947ء کے بعد: اس کے بعد مجھے صرف اتنا اور کہنا ہے کہ اگر یہ تقریر قائداعظمؒ کی زندگی کی آخری تقریر ہوتی تو پھر بھی اس مغالطہ آفرینی کی گنجائش نکل سکتی تھی کہ وہ جو کچھ دس سال تک کہتے رہے تھے، آخر میں وہ اس سے تائب ہو گئے تھے۔ اس لئے اب سند ان کی آخری تقریر ہو سکتی ہے۔ حسن اتفاق کہ قائداعظمؒ اس کے بعد بھی ایک سال تک زندہ رہے اور (اگرچہ ان کا یہ تمام عرصہ انتہائی نازک بیماری کے عالم میں گزرا لیکن بایں ہمہ) انہوں نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں

پھر اس کی وضاحت کر دی کہ پاکستان کس قسم کی سٹیٹ ہوگی۔ انہوں نے فروری 1948ء میں اہل امریکہ کے نام جو پیغام براڈ کاسٹ کیا تھا۔ اس کا ایک حصہ ہم پہلے نقل کر چکے ہیں۔ انہوں نے اس کے شروع میں کہا تھا۔

> یہ تقریر قائداعظمؒ کی زندگی کی آخری تقریر ہوتی تو پھر بھی اس مغالطہ آفرینی کی گنجائش نکل سکتی تھی کہ وہ جو کچھ دس سال تک کہتے رہے تھے، آخر میں وہ اس سے تائب ہو گئے تھے۔ اس لئے اب سند ان کی آخری تقریر ہو سکتی ہے۔ حسن اتفاق کہ قائداعظمؒ اس کے بعد بھی ایک سال تک زندہ رہے اور انہوں نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں پھر اس کی وضاحت کر دی کہ پاکستان کس قسم کی سٹیٹ ہوگی۔

مملکت پاکستان، جو دس کروڑ مسلمانوں کے حسین نصب العین کا ایک حد تک حصول ہے، 15 اگست 1947ء کو وجود میں آ گئی تھی، یہ دنیا میں سب سے بڑی اسلامک سٹیٹ اور تمام دنیا کی مملکتوں میں پانچویں درجہ پر ہے۔

(تقاریر بحیثیت گورنر جنرل، ص 63)

انہوں نے اسی ماہ (فروری 1948ء میں) آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں فرمایا تھا:

مغربی پاکستان، مشرقی پاکستان سے تقریباً ایک ہزار میل کے فاصلے پر ہے اور ان کے درمیان مملکت ہند کا علاقہ حائل ہے۔ بیرونی ممالک کے ایک طالب علم کے دل میں جو پہلا سوال ابھرے گا وہ یہ ہوگا کہ (ایسی مملکت کا قیام) کس طرح ممکن ہوگا۔ ایسے دو خطوں میں، جن میں اس قدر بُعد ہو، وحدت حکومت کس طرح ممکن ہوگی۔ میں اس سوال کا جواب صرف ایک لفظ میں دوں گا جو یہ ہے.....

ایسا، ہمارے ایمان کی رو سے ہوگا۔ ایمان خدا پر، ایمان اپنے آپ پر، ایمان مستقبل پر، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ ہم سے اچھی طرح واقف نہیں وہ ایسے مختصر سے جواب کا پورا پورا مفہوم سمجھ نہ سکیں گے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس اجمال کی تھوڑی سی تفصیل بھی بیان کر دوں، اس کے بعد انہوں نے فرمایا:

پاکستان کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہم محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کے پیرو ہیں۔ ہم اس اسلامی برادری کے ارکان ہیں جن میں حقوق، شرف و احترام اور تکریم ذات کے اعتبار سے تمام افراد برابر ہوتے ہیں۔ بنابریں، ہم میں اخوت اور وحدت کا بڑا گہرا جذبہ ہے۔ ہماری اپنی تاریخ ہے اور اپنی رسوم و روایات ہیں۔ ہم اپنے اسالیب فکر، نقطہ نگاہ اور احساس دروں کے مالک ہیں اور یہی ہیں

وہ عوامل جو قومیت کی تشکیل کا مدار بنتے ہیں۔ (تقاریر بحیثیت گورنر جنرل، ص58)

اگر ہم مملکت پاکستان کی بنیاد قرآن مجید پر رکھتے اور اس کی تعلیم کو عام کرتے جاتے تو ہو نہیں سکتا تھا کہ مشرقی پاکستان علیحدہ ہو جاتا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے قرآن کریم کے رشتہ سے امت واحدہ ہونے کے اصول و نظریہ کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا اور وطن اور نسل کی تفریق کے تصور کو عام ہونے دیا، اس کا لازمی نتیجہ تشتت و افتراق تھا۔

''ایمان، ایمان خدا پر، ایمان اپنے آپ پر، ایمان اپنے مستقبل پر'' یہ تھی وہ اساس محکم جس پر مملکت پاکستان کی یہ رفیع و عظیم عمارت استوار ہوئی تھی۔ قائداعظمؒ نے 7 اپریل 1948ء کو گورنمنٹ ہاؤس پشاور میں ایک قبائلی جرگہ کے ساتھ گفتگو کے دوران فرمایا:

> ہم مسلمان، ایک خدا، ایک کتاب (قرآن مجید) اور ایک رسول ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں، اس لئے ہمیں ایک قوم کی حیثیت سے صف بستہ ہونا ہوگا۔
>
> (تقاریر بحیثیت گورنر جنرل، ص126)

انہوں نے 14 فروری 1948ء کو سبی دربار میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

> میرے پیش نظر ہمیشہ اسلامی ڈیموکریسی کا اصول رہا ہے۔ یہ میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات کا راز ان سنہرے اصولوں کے اتباع میں ہے۔ جنہیں ہمارے مقنن اعظم حضور نبی کریم ﷺ نے ہمیں عطا فرمایا ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنی ڈیموکریسی کی بنیاد حقیقی اسلامی نظریات اور اصولوں پر رکھنی چاہئے۔
>
> (تقاریر بحیثیت گورنر جنرل، ص56)

میرے پیش نظر ہمیشہ اسلامی ڈیموکریسی کا اصول رہا ہے۔ یہ میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات کا راز ان سنہرے اصولوں کے اتباع میں ہے۔ جنہیں ہمارے مقنن اعظم حضور نبی کریم ﷺ نے ہمیں عطا فرمایا ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنی ڈیموکریسی کی بنیاد حقیقی اسلامی نظریات اور اصولوں پر رکھنی چاہئے۔
(قائداعظم۔ تقاریر بحیثیت گورنر جنرل، ص56)

تقسیم ہند کے عواقب میں، جب انگریز، ہندو اور سکھوں کی سازش نے ہمارے خلاف قیامت برپا کر دی تھی تو قوم شکستہ خاطر سی ہو رہی تھی۔ عین اس حالت میں آپ نے 30 اکتوبر 1947ء کو یونیورسٹی گراؤنڈ لاہور میں تقریر کرتے ہوئے قوم کا حوصلہ بندھایا اور کہا کہ یاد رکھو!

> ایسے نامساعد حالات میں بھی اگر ہم نے قرآن مجید سے بصیرت اور راہنمائی حاصل کی تو میں، ایک بار پھر یہ کہتا ہوں کہ آخرالامر فتح ہماری ہی ہوگی۔ (تقاریر بحیثیت گورنر جنرل، ص30)

میں پوچھنا چاہتا ہوں ارباب بصیرت سے کہ ایک سیکولر سٹیٹ کا مدعی کیا اس قسم کے نظریات پیش کرے گا؟ اس موضوع پر کہنے کو تو ابھی بہت کچھ اور بھی کہا جا سکتا ہے اور میں گذشتہ تیس سال سے اس پر لکھتا چلا آ رہا ہوں.....لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

ایسے نامساعد حالات میں بھی اگر ہم نے قرآن مجید سے بصیرت اور راہنمائی حاصل کی تو میں، ایک بار پھر یہ کہتا ہوں کہ آخرالامر فتح ہماری ہی ہوگی۔ (تقاریر بحیثیت گورنر جنرل، ص30)

میں پوچھنا چاہتا ہوں ارباب بصیرت سے کہ ایک سیکولر سٹیٹ کا مدعی کیا اس قسم کے نظریات پیش کرے گا؟

بجز اس کے کہ.....

انہوں نے 8 مارچ 1944ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

آپ نے غور فرمایا کہ پاکستان کے مطالبہ کا جذبہ محرکہ کیا تھا؟ مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت کی وجہ جواز کیا تھی؟ تقسیم ہند کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کی وجہ نہ ہندوؤں کی تنگ نظری ہے نہ انگریزوں کی چال۔ یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ تھا۔ (قائداعظمؒ کا پیغام، مرتبہ سید قاسم محمود، ص52)

(2) انہوں نے ایسوسی ایٹڈ پریس امریکہ کے نمائندہ کو نومبر 1945ء کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا:

''پاکستان ایک مسلم سٹیٹ ہوگی۔'' (تقاریر، جلد دوم، ص 326, 27)

(3) انہوں نے اسلامیہ کالج پشاور کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے 13 جنوری 1948ء کو فرمایا:

ہم نے پاکستان کا مطالبہ ایک زمین کا ٹکڑا حاصل کرنے کے لئے نہیں کیا تھا، بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں ہم اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں۔

(4) اور حرف آخر یہ کہ انہوں نے تحریک پاکستان کے دوران متعدد بار قوم کو متنبہ کیا کہ:

اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس ملک سے اسلام کا نام و نشان نہ مٹ جائے تو اس کے لئے پاکستان نہ صرف یہ کہ ایک عملی نصب العین ہے، بلکہ یہی اور صرف یہی واحد نصب العین ہے۔ یاد رکھو! اگر ہم اس جدوجہد میں ناکام رہ گئے تو نہ صرف یہ کہ ہم تباہ ہو جائیں گے، بلکہ اس برصغیر میں مسلمانوں کا اور اسلام کا نام و نشان تک مٹ جائے گا۔ (تقاریر، جلد اول، ص 267، جلد دوم، ص255)

کیا اس کے بعد بھی اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی دقت پیش آ سکتی ہے کہ قائداعظمؒ کس قسم کی سٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے؟ اسلامک یا سیکولر؟

آخر میں، میں مناسب سمجھتا ہوں کہ مختصر الفاظ میں یہ بتا دوں کہ اسلامک سٹیٹ، سیکولر سٹیٹ اور تھیا کریسی میں فرق کیا ہوتا ہے اور قائداعظمؒ نے سیکولر سٹیٹ کی طرح تھیا کریسی کی بھی مخالفت کیوں کی تھی۔

آخر میں، میں مناسب سمجھتا ہوں کہ مختصر الفاظ میں یہ بتا دوں کہ اسلامک سٹیٹ، سیکولر سٹیٹ اور تھیا کریسی میں فرق کیا ہوتا ہے اور قائداعظمؒ نے سیکولر سٹیٹ کی طرح تھیا کریسی کی بھی مخالفت کیوں کی تھی۔

تھیا کریسی کا تصور تو پرانا ہے لیکن اسے بطور نظام حکومت، عیسائی کلیسا (چرچ) نے یورپ میں رائج کیا۔ عیسائیت میں حکومت کا تصور تک نہیں۔ نہ ہی (مروجہ) انجیل میں قوانین دیئے گئے ہیں۔ اس لئے عیسائی پادریوں کی حیثیت مشنریوں (مبلغین) سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ جب بعض بادشاہوں نے عیسائیت قبول کی تو پادریوں کے دل میں بھی جذبہ اقتدار پرستی نے انگڑائی لی۔ انہوں نے بادشاہوں سے سمجھوتہ کیا کہ احکام وقوانین کلیسا (چرچ) وضع کرے لیکن وہ نافذ حکومت کی طرف سے ہوں اور یہ سارا کاروبار خدا کے نام پر ہو۔ یعنی ان احکام وقوانین کو احکام خداوندی کہہ کر پکارا جائے اور انہیں نافذ کرنے والے حکمرانوں کو شریعت خداوندی کے محافظ قرار دیا جائے۔ اس سے ایک طرف، مذہبی پیشوائیت کے جذبہ اقتدار کی تسکین کا سامان فراہم ہو گیا اور دوسری طرف، حکمرانوں کو مقبولیت عامہ حاصل ہو گئی، کیونکہ عوام مذہب پرست تھے اور مذہب کے محافظ ان کے نزدیک خدائی اختیارات اور الوہیاتی احترام وتقدیس کے حامل۔ (انگلستان کے بادشاہ یا ملکہ کو آج تک Defender of the Faith) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ مذہب اور حکومت کی اس ملی بھگت کو تھیا کریسی (یعنی حکومت خداوندی) سے تعبیر کیا گیا۔ اس نظام حکومت میں انسانیت ظلم واستبداد کے جس جہنم میں مبتلا رہی، اس کے تصور تک سے (ہمارا اور آپ کا ہی نہیں) ہلاکو اور چنگیز تک کا کلیجہ دہل جاتا ہے۔ نوع انسان کی تاریخ میں، تھیا کریسی سے بدتر دور کبھی نہیں آیا۔ ہلاکو اور چنگیز خاں کے دل میں شاید کبھی کھٹک پیدا ہو جاتی ہو کہ ہم بے گناہوں پر کیوں ظلم کر رہے ہیں لیکن جو ظلم وتشدد خدا کے نام پر برپا کیا جائے اس سے تو ظالم اور مستبد حکمران اطمینان ہی نہیں، فخر محسوس کرتا ہے کہ میں خدائی مشن پورا کر رہا ہوں۔

مختصر الفاظ میں تھیا کریسی سے مراد ہے ایسا نظام حکومت جس میں انسانوں کے وضع کردہ احکام وقوانین کو احکام خداوندی کہہ کر نافذ کیا جائے اور ان کی مخالفت کرنے والوں کو مرتد قرار دے کر حوالہ دار ورسن کر دیا جائے۔ ان مظالم کی بنا پر تھیا کریسی کے خلاف جو ردعمل ہوا اسے سیکولرازم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس نظام کے حامیوں نے کہا کہ مذہب کو مملکت اور حکومت سے کوئی واسطہ نہیں۔ مذہب کا دائرہ گرجا کی چار دیواری تک محدود ہے۔ مملکت کے معاملات، قوم کی منشاء کے مطابق،

کسی قسم کی حدود و قیود کے بغیر' آزادانہ طے پائیں گے۔ انہوں نے مذہب کے لبادہ کے ساتھ' اخلاقی اقدار و اصول کی ''صدری'' کو بھی اتار کر دور پھینک دیا۔ یہ ہے سیکولر نظام حکومت جس میں قانون سازی کے کلی اختیارات' کسی قسم کی حدود و شرائط کے بغیر' قوم (انسانوں) کو حاصل ہوتے ہیں۔ اس وقت یہ نظام حکومت (کم وبیش) ساری دنیا میں رائج ہے (اور ساری دنیا اس کے ہاتھوں نالاں بھی ہے)۔

> اسلامی مملکت میں حق حکومت نہ مذہبی پیشوائیت کو حاصل ہوتا ہے نہ ملک کے دیگر باشندوں کو' یعنی وہ تھیاکریسی' سیکولرازم یا انگریزوں کی وضع کردہ تھیاکریسی+سیکولرازم' سب کے خلاف ہوتی ہے۔ اس میں حق حکومت خدا کی کتاب (قرآن مجید) کو حاصل ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں وہ اصول اور اقدار دیئے گئے ہیں جو ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ مملکت کا فریضہ ان اصول و اقدار کو نافذ کرنا ہوتا ہے۔ ان کی تنفیذ کے طور طریقے قوم (امت) کے باہمی مشورہ سے طے کئے جاتے ہیں۔ انہیں آپ جزئی قوانین کہہ لیجئے۔ شرط اس میں بھی یہ ہوتی ہے کہ یہ قرآن کے کسی اصول و اقدار سے ٹکرائیں نہیں۔

جب انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کی تو انہوں نے دیکھا کہ اس ملک کے باشندے سخت قسم کے مذہب پرست واقعہ ہوئے ہیں۔ اس بنا پر انہوں نے سوچا کہ یہاں یورپ کی شکل کی سیکولرازم چل نہیں سکے گی۔ انہوں نے اس میں یہ ترمیم کی کہ قوانین کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک شخصی قوانین۔ (Personal Laws) اور دوسرے ملکی قوانین (Public Laws) انہوں نے کہا کہ شخصی قوانین کی حد تک ہر شخص کو آزادی ہوگی کہ وہ اپنے عقیدہ اور مسلک کے مطابق ان کا اتباع کرے لیکن پبلک لاز میں مذہب کو کوئی دخل نہیں ہوگا۔ یعنی انہوں نے پرسنل لاز کی حد تک' تھیاکریسی رائج کر دی اور پبلک لاز کے لئے سیکولرازم' ہمارے مذہب پرست طبقہ نے اسے مذہبی آزادی سے تعبیر کیا اور وہ اس کے لئے سلطنت انگلشیہ کا بے حد شکر گزار رہا۔ خود ہمارے ہاں کی ملوکیت نے بھی یہی مسلک اختیار کر رکھا تھا۔ تحریک پاکستان کے دوران' یہی موقف (ہندوؤں اور) نیشنلسٹ علماء کا تھا اور اسی کو ساتھ لے کر وہ پاکستان آئے۔ ان کے برعکس اقبالؒ اور قائداعظمؒ نے اسلامی مملکت کا تصور اور مطالبہ پیش کیا۔

اسلامی مملکت میں حق حکومت نہ مذہبی پیشوائیت کو حاصل ہوتا ہے نہ ملک کے دیگر باشندوں کو' یعنی وہ تھیاکریسی' سیکولرازم یا انگریزوں کی وضع کردہ تھیاکریسی+سیکولرازم' سب کے خلاف ہوتی ہے۔ اس میں حق حکومت خدا کی کتاب (قرآن مجید) کو حاصل ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں وہ اصول اور اقدار دیئے گئے ہیں جو ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ مملکت کا

فریضہ ان اصول و اقدار کو نافذ کرنا ہوتا ہے۔ ان کی تنفیذ کے طور طریقے قوم (امت) کے باہمی مشورہ سے طے کئے جاتے ہیں۔ انہیں آپ جزئی قوانین کہہ لیجئے۔ شرط اس میں بھی یہ ہوتی ہے کہ یہ قرآن کے کسی اصول و اقدار سے ٹکرائیں نہیں۔ ان میں پبلک لاز اور پرسنل لاز کی کوئی تفریق اور تمیز نہیں ہوتی۔ پبلک لاز کی طرح ان سب کا اطلاق ملک کے تمام مسلم باشندوں پر یکساں ہوتا ہے۔ یہ قوانین زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہیں گے اور قرآنی اصول و اقدار (جنہیں حدود اللہ کہہ لیجئے) ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے۔ اس مشاورت کی عملی شکل کیا ہوگی' اسے بھی امت' باہمی مشورے سے (مندرجہ بالا شرط کے تحت) خود طے کرے گی۔

یہ ہیں اسلامی مملکت کے نمایاں خط و خال..... قرآن کریم نے بہ نص صریح کہہ دیا ہے کہ اس کے سوا جو نظام حکومت بھی ہے وہ کافرانہ نظام ہے' ارشاد خداوندی ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾ (5:44)

جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہی کافر ہیں۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آ گئی ہوگی کہ جو چیز اسلامی نظام مملکت کو غیر اسلامی نظام سے متمیز اور ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی مملکت میں قانون سازی کے اختیارات ان اصول و اقدار خداوندی سے مشروط اور ان کے تابع ہوتے ہیں جنہیں حدود اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ حدود منزل من اللہ ہوتے ہیں اور ابدی اور غیر متبدل۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو متعدد مقامات میں دہرایا ہے۔ سورہ الانعام میں ہے:

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ (6:115)

''تیرے رب کے اصول و قوانین' صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے۔ اب ان میں کوئی اتھارٹی تبدیلی نہیں کر سکتی''۔

(نیز 27:18،34:6) سورۃ یونس میں ہے: لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۭ (10:64)

''قوانین و حدود خداوندی میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا''۔ اس کے برعکس دنیا کے ہر نظام میں (خواہ وہ ملوکیت ہو خواہ آمریت اور خواہ مغرب کی جمہوریت) قانون سازی کے اختیارات پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہوتی' یہی بنیادی تخصیص' اسلامی اور غیر اسلامی نظام میں مابہ الامتیاز ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ قائداعظمؒ پاکستان میں سیکولر سٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے' تو پھر مسلمانوں کے لئے جداگانہ مملکت کی وجہ جواز باقی نہیں رہتی۔ جو لوگ بددیانتی سے ایسا کہتے ہیں ان کا مقصد یہی ہے۔ اقبالؒ اور قائداعظمؒ نہ سیکولر سٹیٹ چاہتے تھے' نہ تھیاکریٹک سٹیٹ' وہ خالصتاً قرآنک سٹیٹ متشکل کرنا چاہتے تھے۔

والسلام، علامہ غلام احمد پرویز (طلوع اسلام دسمبر 1980ء)

شیخ اللہ دتا ایڈووکیٹ، لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اُسوۂ حسنہ (مسلسل)

نبیٔ کریم ﷺ کی طرف سے دعوتِ ایمان کو دل کی گہرائی سے قبول کرنے والے مؤمنین کی انفرادی زندگی ایمانی تقاضوں کے مطابق تغیر آشنا ہو جاتی ہے۔ ان مومنین کی تنظیم کے لئے نبیٔ کریم ﷺ نے تشکیلِ اُمت کا آغاز کیا اور مومنین کے بھائی چارے اور نئی اخوت کو عملی شکل دینے کے لئے نظامِ صلوٰۃ قائم کیا۔ نظامِ صلوٰۃ سے مراد ہے ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا جس میں افرادِ معاشرہ قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتے، اپنی منزلِ مقصود تک جا پہنچیں۔ نظامِ صلوٰۃ قائم کرنے سے معاشرہ میں کیا تبدیلی مقصود ہے۔ یہ تبدیلی ہے ''ایتائے زکوٰۃ''۔ زکوٰۃ کے معنی ہیں نشوونما، بالیدگی، پھولنا، بڑھنا، خامیوں اور کمیوں کا دور کرکے نوعِ انسان کی نشوونما (Growth) یا (Development) کا سامان بہم پہنچانا۔ اس نشوونما میں انسان کی طبعی زندگی کی پرورش اور اس کی ذات کی نشوونما دونوں شامل ہیں۔

> اے جماعتِ مؤمنین جو کچھ کماؤ اس میں سے بہترین حصہ نظامِ ربوبیت کو قائم کرنے کے لئے کھلا رکھو (3:91)
> یاد رکھو! خدا کا نظام ایسا نہیں کہ وہ بھیک مانگتا پھرے اور تم اس کی جھولی میں بچے کھچے ٹکڑے ڈال دو (2:267)

ایتائے زکوٰۃ:

سورۃ الحج میں ارشادِ خداوندی ہے:

اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَنَہَوۡا عَنِ الۡمُنۡکَرِ ؕ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الۡاُمُوۡرِ ﴿۴۱﴾ (22:41)

مفہوم: ''(مظلوموں کی یہ جماعت جو دُنیا سے ظلم اور سرکشی کو مٹانے کے لئے اٹھی ہے) اگر ہم نے انہیں ملک میں حکومت عطا کر دی، انہیں اقتدار حاصل ہو گیا تو (یہ ظلم اور استبداد نہیں کریں گے) یہ نظامِ صلوٰۃ قائم

کریں گے (تا کہ تمام افرادِ معاشرہ قوانین خداوندی کا اِتباع کرتے چلے جائیں)۔ یہ تمام نوعِ اِنسانی کو سامانِ نشوونما بہم پہنچائیں گے۔ یہ ان احکام کو نافذ کریں گے جنہیں قانونِ خداوندی (قرآن) صحیح تسلیم کرتا ہے اور تمام ایسے کاموں سے روکیں گے جنہیں وہ جائز قرار نہیں دیتا۔ غرضیکہ (یہ ہر پیش آمدہ معاملہ کے متعلق دیکھیں گے کہ اس باب میں خدا کا قانون کیا کہتا ہے۔ اس طرح ان کی حکومت میں، بحث وتمحیص اور باہمی مشاورت کے بعد، آخرالامر) ہر معاملہ کا فیصلہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوگا (5:44)۔''

ایمان، اعمالِ صالحہ اور اقامت صلوٰۃ کے ساتھ ایتائے زکوٰۃ کا حکم سورۃ البقرہ کی آیت (2:277) میں ملاحظہ فرمائیں:

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ لَہُمۡ اَجۡرُہُمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ۚ وَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۲۷۷﴾ (2:277)

مفہوم: ''خدا پر اِیمان رکھنے اور اُس کے تجویز کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا رہنے والے، بھلا ایسا اِنسانیت سوز نظام کس طرح قائم کر سکتے ہیں؟ وہ ایسا نظام قائم کرتے ہیں جس میں ہر فرد قوانینِ خداوندی کا اِتباع کرے، اور نوعِ اِنسان کی نشوونما کا سامان فراہم کرتا چلا جائے۔ یہ ہیں وہ لوگ جن کے حسن عمل کا صلہ، نظامِ ربوبیت کی شکل میں، سامنے آتا ہے اور اِس طرح انہیں نہ کسی قسم کا خوف لاحق ہوتا ہے، نہ غمگینی ستاتی ہے۔''

دعوتِ ایمان، صالحیتِ اعمال، تشکیلِ اُمت کے لئے اقامتِ صلوٰۃ کے موضوعات سے متعلق اسوۂ حسنہ کے امور سابقہ تحریروں میں آپ کے سامنے آچکے ہیں۔ زیرِ نظر موضوع ''ایتائے زکوٰۃ'' کی وضاحت پیش کی جاتی ہے۔ (امر بالمعروف۔ نہی عن المنکر اور جملہ امور میں خدائی قوانین کی اطاعت کے موضوعات آئندہ پیش کئے جائیں گے)۔

سورۃ البقرہ کے شروع میں متقین کی صفات بیان کرتے ہوئے، ایمان بالغیب اور اقامتِ صلوٰۃ کے بعد یہ صفت بیان ہوئی ہے:

وَمِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ (2:3)

مفہوم: ''اور جو سامان نشوونما ہم (اللہ تعالیٰ) نے انہیں دیا ہے، اس میں سے اپنی ضروریات کے بقدرے کر (2:219) باقی نوعِ انسان کی پرورش کے لئے کھلا رکھتے ہیں۔''

یہ سامانِ نشوونما کونسا ہے اور اس کے دینے کی حیثیت کیا؟

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِنۡ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبۡتُمۡ وَمِمَّاۤ اَخۡرَجۡنَا لَکُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ ۫ وَلَا تَیَمَّمُوا الۡخَبِیۡثَ مِنۡہُ تُنۡفِقُوۡنَ وَلَسۡتُمۡ بِاٰخِذِیۡہِ اِلَّاۤ اَنۡ تُغۡمِضُوۡا فِیۡہِ ؕ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیۡدٌ (2:267)

مفہوم: ''لہٰذا اے جماعتِ مومنین! تم زمین کی پیداوار میں سے بھی اور اپنی صنعت وحرفت سے جو کچھ کماؤ اس میں سے بھی بہترین حصہ کو نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے کھلا رکھو (3:91) ۔ اِس قسم کا بھولے سے بھی اِرادہ نہ کرو کہ اِس مد میں ایسی نکمی چیزیں دے دی جائیں جنہیں تم اُن کی اصلی قیمت پر خریدنے کے لئے تیار نہ ہو بلکہ ان میں نقص کی وجہ سے اُن کی قیمت کم کراؤ۔ یاد رکھو! خدا کا نظام ایسا نہیں کہ وہ بھیک مانگتا پھرے اور تم اس کی جھولی میں بچے کھچے ٹکڑے ڈال دو۔ وہ اس قسم کی خیرات سے بے نیاز اور ہر قسم کی ستائش کا سزاوار ہے۔ (وہ تم سے جو کچھ مانگتا ہے تمہارے فائدے کے لئے مانگتا ہے —— اپنے لئے نہیں مانگتا)۔''

نظامِ خداوندی کے لئے اپنی دولت بطورِ قرض دینا' عبوری دور کا انتظام ہے اور اس کا کئی گنا بڑھ کر واپس ہونا خدائی فیصلہ۔ اس بارے میں درج ذیل آیات کا مطالعہ بھی اس امر کی مزید وضاحت کرے گا:۔
(57:11؛2:245؛64:17؛5:12)

انفاقِ فی سبیل اللہ میں بالعموم مال دیا جاسکتا ہے اور مختلف کاموں میں اپنی خدمات کی پیش کش (منت یا نذر) بھی کی جاسکتی ہے۔

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝۲۷۰
(2:270)

مفہوم: ''جو کچھ تم خرچ کرنے کی چیزوں سے خرچ کرتے ہو یا جو کچھ تم (مالی امداد کے علاوہ' دیگر امور میں) اپنے اوپر واجب قرار دے لیتے ہو مثلاً مختلف کاموں کے لئے اپنی خدمات کی پیشکش (76:7; 9:79)' تو اُن میں سے ہر بات' خدا کے قانونِ مکافات کی نگاہوں میں ہوتی ہے اور وہی تمہارا مؤید اور مددگار رہوتا ہے۔ وہ' اُن کا حامی وناصر نہیں ہوتا جو قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتیں۔''

انفاق کی مد میں اموال دینے یا خدمات کی پیش کش کے علاوہ' جب کبھی حکومت اسلامی کو قرض کی ضرورت پڑے تو اس کی مجوزہ سکیموں میں قرض دینا بھی انفاق فی سبیل اللہ ہے:

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ؕ (73:20)

مفہوم: ''اور اس طرح آہستہ آہستہ نظامِ صلوٰۃ قائم کرتے جاؤ اور نوعِ انسانی کی نشوونما کا انتظام کرو اور ان مقاصد کے حصول کے لئے اپنی دولت اس نظام کو بطورِ قرض دے دو، جو تمہیں کئی گنا ہو کر واپس مل جائیگی۔ مختصراً یوں سمجھ لو کہ (اس پروگرام کے ابتدائی دور میں) جو اچھا کام بھی تم کرو گے اسے ہم تمہارے کھاتے

میں جمع کرتے جائیں گے۔ آخرالامر وہ سب کا سب تمہیں واپس مل جائے گا اور اس کا اجرِ عظیم الگ ہوگا۔''

ابتدائی عبوری دور کی معاشی سکیموں میں دولت بطورِ قرض دینا بھی انسانی نشوونما کے حصول کی مدد میں معاونت کا ذریعہ بنتا ہے اور یہ سکیمیں بارآور ہو کر قرض دی گئی رقم سے کئی گنا زیادہ فراہم کرتی ہیں:

اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ (57:18)

مفہوم: یاد رکھو! جو لوگ۔۔۔ مرد ہوں یا عورتیں۔۔۔ اپنے دعوائے ایمان کو، اپنے اعمال سے سچا کر کے دکھاتے ہیں۔ یعنی حسن کارانہ انداز سے، اپنی دولت کو نظامِ خداوندی کے لئے ''قرض'' دیتے ہیں تو ان کا دیا ہوا، انہیں، بڑھ چڑھ کر واپس مل جاتا ہے، اور اس کے ساتھ انہیں نہایت عزت وتکریم کی زندگی عطا ہوجاتی ہے (اس دنیا میں، اور آخرت میں بھی)۔''

نظامِ خداوندی کے لئے اپنی دولت بطورِ قرض دینا' عبوری دور کا انتظام ہے اور اس کا کئی گنا بڑھ کر واپس ہونا خدائی فیصلہ۔ اس بارے میں درج ذیل آیات کا مطالعہ بھی اس امر کی مزید وضاحت کرے گا:۔

(57:11؛2:245؛64:17؛5:12)

یہ انفاقِ فی سبیل اللہ مومن کے ایمان کا تقاضا ہے خواہ اس کی حیثیت انفرادی ہو یا وہ تنظیم کے اندر عبوری دور سے گزر رہا ہو یا نظامِ خداوندی پورے طور پر نافذ ہو چکا ہو۔ تقاضائے ایمان کے حوالہ کے لئے ملاحظہ ہو قرآن کریم کی آیت:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (2:177)

مفہوم: یہ لوگ' اِس طرح دین کے مقصد سے بیگانہ ہو جاتے ہیں' اور چند رسوم ومناسک کو اصل دین سمجھ کر اُن کی پابندی کو اُس کی غایت سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن' تم کہیں اِس فریب میں نہ آ جانا۔ تم اِس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو کہ قانونِ خداوندی کی رُو سے' وسعت وکشاد کی راہ (جس سے اِنسان معیارِ خداوندی پر پورا اُترتا ہے) یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف [اگرچہ اُمت میں وحدت اور یک جہتی پیدا کرنے کے لئے اِس قسم کے محسوس شعائر کی پابندی بھی ضروری ہوتی ہے لیکن یہ مقصود بالذات نہیں

ہوتے]۔ مقصود اُس نظام کا قیام ہے جس کے اُصولِ اساسی یہ ہیں:

اللہ پر اِیمان، قانونِ مکافات اور حیاتِ اُخروی پر اِیمان، اُن کائناتی قوتوں پر اِیمان جو مشیت کے پروگرام کو بروئے کار لانے میں واسطہ بنتی ہیں۔ انبیاء کرامؑ پر اِیمان جن کی وساطت سے خدا کا پیغام اِنسانوں تک آتا رہا ہے اور اُن کی وساطت سے ملی ہوئی کتابوں پر اِیمان (2:4)۔

اِس اِیمان (آئیڈیالوجی) کے بعد عملی دنیا میں یہ رَوش کہ مال و دولت کی محبت کے باوجود، اُسے دوسروں کی پرورش کے لئے عام کر دینا (3:91) —— وہ رشتہ دار ہوں یا ایسے لوگ جو معاشرہ میں لاوارث اور تنہا رہ جائیں۔ یا وہ لوگ جن کا چلتا ہوا کاروبار رُک جائے، یا ان میں کام کاج کی اِستعداد باقی نہ رہے۔ یا ایسے مسافر جو کسی طرح زادِ سفر سے محروم رہ جائیں۔ یا وہ لوگ جن کی کمائی اُن کی ضروریات کے لئے کافی نہ ہو یا جو دوسروں کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوں، انہیں آزادی دلانے اور اِن کی ضروریات پوری کرنے کے لئے اپنی دولت کو وقف کر دینا۔ مختصر الفاظ میں ایسا نظام قائم کرنا جس میں افرادِ معاشرہ قوانین خداوندی کا اِتباع کرتے چلے جائیں اور تمام ضرورت مندوں کو سامانِ نشوونما مہیا ہوتا رہے۔ اپنے عہد و پیمان کا اِحترام کرنا اور قول و اِقرار کا پکا ہونا۔ لیکن اگر مخالفت قوتیں آمادۂ پیکار ہو جائیں تو پھر مصائب و مشکلات کا نہایت ثابت قدمی اور اِستقامت سے مقابلہ کرنا، اور خوف و ہراس کو پاس نہ پھٹکنے دینا۔

> نظامِ اسلامی کے اس عبوری دور میں ہنگامی ضروریات پورا کرنے کے لئے جو عطیات وصول کئے جاتے تھے، اُنہیں صدقات کہا گیا ہے۔ ہنگامی ضروریات کا تذکرہ سورۃ التوبہ کی آیت (9:6) میں آیا ہے۔

جو لوگ اِس رَوش پر اِستقامت سے گامزن رہتے ہیں، وہی اپنے دعوائے اِیمان میں سچے ہوتے ہیں اور انہی کو یہ کہنے کا حق ہے کہ وہ قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہوئے خطرات کی گھاٹیوں سے بچتے ہیں (نہ وہ جو چند رسومات کے مجموعہ کا نام دین رکھ کر، اُن کی ادائیگی سے جنت کے وارث بننے کا دعویٰ کرتے ہیں)۔

تقاضائے ایمان کے مطابق اپنا مال دوسروں کی پرورش کے لئے عام کر دینے کے مواقع کا تذکرہ مندرجہ بالا آیت (2:177) میں آیا ہے۔ یہ انفرادی طور پر یا عبوری دور میں اخراجات کے مواقع ہیں۔ نظامِ اسلامی کے اس عبوری دور میں ہنگامی ضروریات پورا کرنے کے لئے جو عطیات وصول کئے جاتے تھے، اُنہیں صدقات کہا گیا ہے۔ ہنگامی ضروریات کا تذکرہ سورۃ التوبہ کی آیت (9:6) میں آیا ہے۔ ارشاد ہے:

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (9:60)

مفہوم: ''یہ اَحکام اُس زمانے سے متعلق ہیں جب ہنوز اِسلامی نظامِ مملکت مکمل طور پر متشکل نہیں ہوا تھا۔ اُس وقت کسی ہنگامی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے جو عطیات وصول کئے جاتے تھے اُنہیں صدقات کہہ کر پکارا گیا ہے۔ صدقات کے متعلق (یعنی اس مال کے متعلق جسے مملکت رفاہِ عامہ کے لئے صرف کرتی ہے) یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس کی تقسیم، کسی کے ذاتی مفاد یا انفرادی جذبات کی تسکین کے لئے نہیں ہوگی۔ یہ درحقیقت اُن لوگوں کا حق ہے:

(1) جو اپنی نشوونما کے لئے دوسروں کے محتاج ہوں۔ یعنی کسی وجہ سے خود کمانے کے قابل نہ ہوں۔

(2) جن کا چلتا ہوا کاروبار، یا نقل وحرکت (کسی وجہ سے) رک گئی ہو۔

(3) جو لوگ صدقات (مملکت کی اس آمدنی) کی وصولی پر مامور ہوں، (ان کی کفالت کے لئے)۔

(4) جن کی تالیفِ قلوب مقصود ہو (یعنی جو لوگ ویسے تو نظامِ خداوندی کی طرف آنے کے لئے تیار ہوں لیکن بعض معاشی موانع ان کے راستے میں اس طرح حائل ہوں کہ وہ انہیں اس طرف آنے نہ دیں۔ اِن موانع کے دُور کرنے میں ان کی امداد کی جائے)۔

(5) جو لوگ دوسروں کی محکومی کی زنجیروں میں جکڑے ہوں، انہیں آزادی دلانے کے لئے۔ (90:13)۔

(6) ایسے لوگ جو دشمن کے تاوان، یا قرض کے بوجھ کے نیچے اِس طرح دب گئے ہوں کہ اس کا ادا کرنا ان کے بس میں نہ ہو۔

(7) نیز، اُن باہر سے آنے والوں کا جنہیں مالی امداد کی ضرورت لاحق ہو جائے۔

(8) ان کے علاوہ، اَور جو کام بھی نظامِ خداوندی کے لئے مفید اور نوعِ اِنسان کی فلاح وبہبود کے لئے ممد و معاون ہوں، انہیں سرانجام دینے کے لئے۔

یہ خدا کے ٹھہرائے ہوئے ضوابط ہیں اور اللہ کے ٹھہرائے ہوئے ضوابط علم وحکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔''

انفاقِ فی سبیل اللہ اور صدقات کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس مد میں کتنا خرچ کیا جائے۔ قرآنِ کریم نے خود اس کا تذکرہ کیا ہے کہ سوال کس قدر کا نہیں، سوال ضرورت کا ہے اور وہ ضرورتیں مندرجہ ذیل بتائی ہیں:

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ (2:215)

مفہوم: ''اے رسولؐ! آپ کے ساتھی آپ سے پوچھتے ہیں کہ اِس کے لئے کس قدر مال کی ضرورت ہوگی اور اُسے کہاں خرچ کرنا ہوگا۔ اِن سے کہیں کہ اِس پروگرام کی اِبتدا معاشرہ کے محدود دائروں سے کی جائے گی۔ اِس لئے، سردست تم یہ دیکھو کہ اِن دائروں میں وہ کون کون سے افراد ہیں جو دوسروں کی مدد کے محتاج

ہیں۔ مثلاً ' سب سے پہلے' اپنے گھروں میں اپنے والدین کو دیکھو۔ پھر' اپنے گھر کی چار دیواری کو وسیع کر کے' اپنے گردوپیش میں بسنے والے اَقربا کو دیکھو۔ پھر اَور آگے بڑھو تو اُنہیں دیکھو جو معاشرہ میں بے یار و مددگار رہ گئے ہیں۔ نیز اُنہیں جن کا چلتا ہوا کاروبار رُک گیا ہے۔ پھر' اس سلسلہ کو اپنی بستی سے آگے بڑھاؤ اور باہر سے آنے والوں کے متعلق دیکھو کہ اُنہیں تمہاری مدد کی کس قدر ضرورت ہے۔ (اِس کی آخری حد وہ ہے جسے (2:219) میں بیان کی گیا ہے)۔

تم اِن لوگوں کی ضروریات کو پورا کرو' اور اس پر یقین رکھو کہ جو کچھ بھی تم دوسروں کی بھلائی کے لئے کرو گے' وہ سب اللہ کے علم میں رہے گا۔ اس میں سے ایک ذرّہ برابر بھی بے نتیجہ نہیں رہنے پائے گا۔''

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۖ قُلِ الْعَفْوَ ۭ (2:219)

مفہوم: اے رسولؐ! آپ کے ساتھی پوچھتے ہیں کہ کس قدر اور کس حد تک مالی قربانی کرنا ہوگی۔ فرما دیجئے کہ (مفت میں ہاتھ آجانے والی دولت کے پیچھے نہ پڑو اپنی محنت سے کماؤ (53:39)۔ اس میں سے بقدر اپنی ضروریات کے اپنے لئے رکھو، اور جس قدر ان سے زائد ہو سب کا سب نوعِ انسان کی پرورش کے لئے کھلا رکھو (تاکہ نظامِ خداوندی اسے ضروری مصرف میں لا سکے)۔

> اسلامی نظام کے نفاذ کے بعد عبوری ادوار میں انفرادی خیر خیرات، عطیات، خدمات کی پیشکش (منت یا نذر)، مختلف ترقیاتی سکیموں میں قرض کے طور پر مالی معاونت، ہنگامی ضرورتوں کے لئے صدقات کا اہتمام۔ معاشرہ میں ضرورتمندوں اور استعداد نہ رکھنے والوں کی نگہبانی جیسے معاملات کے لئے مال اور وسائل کی فراہمی کا خصوصی اہتمام کیا جائے گا اور نظام کی مکمل تشکیل کے بعد معاشرہ میں کوئی شخص بھوکا نہیں سوئے گا۔

تعین مدارج میں اپنی ضرورت سے زائد خرچ کر دینا اور نوعِ انسان کی پرورش کے لئے کھلا رکھنا، آخری حد نہیں ہے۔ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:

يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۭ (59:9)

مفہوم: ''یہ مومنین دوسرے بھائیوں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے ہیں، خواہ انہیں خود تنگی ہی سے گزارہ کیوں نہ کرنا پڑے۔''

اسلامی نظام میں قرآنِ کریم کے پیشِ کردہ معاشی پروگرام کی رُو سے مملکت کی ساری آمدنی ''زکوٰۃ'' ہے کیونکہ اسے نوعِ انسان کی نشوونما کے لئے صرف کیا جاتا ہے (ایتائے زکوٰۃ کے معنی نشوونما دینا ہے) جسے آج کل ''زکوٰۃ'' کہا جاتا ہے قرآنِ کریم میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔ بالعموم کہا جاتا ہے کہ اسلامی حکومت زکوٰۃ وصول کرتی ہے جبکہ حکم وصولی کا نہیں، نشوونما دینے کا ہے، ایتائے زکوٰۃ کا ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں مؤمنون کا فریضہ بیان ہوا ہے:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ (23:4)

مفہوم: اور وہ اس پروگرام پر عمل پیرا ہو گئے جس سے تمام نوعِ انسان کو نشوونما کا سامان بہم پہنچتا رہے۔ ان کے اعمال و افعال اس مقصد کے لئے ہوتے ہیں کہ نوعِ انسان کو سامانِ نشوونما پہنچتا رہے۔ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ___ وہ کام کرتے ہیں زکوٰۃ کی خاطر (22:41)۔

اسلامی نظام کے نفاذ کے بعد عبوری ادوار میں انفرادی خیر خیرات، عطیات، خدمات کی پیشکش (منت یا نذر)، مختلف ترقیاتی سکیموں میں قرض کے طور پر مالی معاونت، ہنگامی ضرورتوں کے لئے صدقات کا اہتمام۔ معاشرہ میں ضرورتمندوں اور استعداد نہ رکھنے والوں کی نگہبانی جیسے معاملات کے لئے مال اور وسائل کی فراہمی کا خصوصی اہتمام کیا جائے گا اور نظام کی مکمل تشکیل کے بعد معاشرہ میں کوئی شخص بھوکا نہیں سوئے گا۔ مملکت سب افراد معاشرہ کی ضرورتوں کی فراہمی کی ذمہ دار ہوگی:

الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ﴿۱۸﴾ (92:18)

مفہوم: یعنی وہ جو عندالضرورت اپنا سب کچھ (مَا لَهٗ) نوعِ انسان کی نشوونما کے لئے دے دیتا ہے، اور اس طرح خود اس کی اپنی ذات کی بھی نشوونما ہو جاتی ہے (9:111)۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (11:6)

مفہوم: (قانونِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے رزق کی فراوانیاں حاصل ہوتی ہیں (11:3)۔ لیکن یہ فراوانیاں کسی خاص گروہ کے اندر محدود ہو کر نہیں رہ جانی چاہئیں۔ رزق، زندگی کے قائم رکھنے کا ذریعہ ہے، اس لئے اسے ہر ذی حیات تک، حسبِ ضرورت، پہنچنا چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ) رُوئے زمین پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذِمہ داری خدا نے نہ لے رکھی ہو۔ اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ ایک ذی حیات کو کسی ایک منزل میں ٹھہرنے، اور پھر قانونِ ارتقا کی رُو سے، اگلی منزل تک پہنچنے کے لئے، کس قدر، اور کون کون سے سامانِ نشوونما کی ضرورت ہوگی (6:98)۔ یہ سب کچھ، خدا کے قانونِ مشیت کی کتاب میں واضح طور پر درج ہے (55:29)۔ (لہٰذا، منشائے خداوندی کو پورا کرنے والا نظام وہی ہو سکتا ہے جس میں کوئی ذی حیات رزق سے محروم نہ رہنے پائے۔ جو نظام، خدا کی ان ذمہ داریوں کو پورا کرے گا، وہی نظامِ خداوندی کہلا سکے گا (36:47; 41:10; 29:60; 6:151)۔

نظامِ خداوندی کی تشکیل سے یہ کٹھن مسئلہ حل ہو جاتا ہے کہ ہر انسان اپنی پوری توانائی سے کمائی کر کے اپنی ضروریات سے زائد کمائی (یا ضروریات روک کر بھی) دوسروں کی نشوونما کے لئے کیوں دے؟ وہ اپنے دل کی رضامندی سے تقاضائے

ایمانی کے مطابق اپنی کمائی دوسروں کی نشوونما کے لئے اس لئے دیتا ہے کہ اس سے اس کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے جس سے اس کو اس دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنت عطا ہوگی:

الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰىۚ﴿۱۸﴾ (92:18)

مفہوم: یعنی وہ جو عندالضرورت اپنا سب کچھ (مَا-لَہٗ) نوعِ انسان کی نشوونما کے لئے دے دیتا ہے، اور اس طرح خود اس کی اپنی ذات کی بھی نشوونما ہوجاتی ہے (9:111)۔

یہ (9:111) درجِ ذیل ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَؕ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَۖ وَعْدًا عَلَیْهِ حَقًّا فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِكُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِهٖؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (9:111)

مفہوم: جماعتِ مومنین کا نظامِ خداوندی کے ساتھ ایک عظیم معاہدہ ہوتا ہے۔ اس معاہدہ کی رُو سے، نظامِ خداوندی، ان کا جان اور مال خرید لیتا ہے اور اس کے معاوضہ میں انہیں جنت کی زندگی کی ضمانت دے دیتا ہے۔ (یعنی اس دنیا میں ان کی تمام ضروریاتِ زندگی کی بہم رسانی اور ان کی صلاحیتوں کے نشوونما پانے کے تمام وسائل و اَسباب کی فراہمی، اس نظام کے ذِمے ہوجاتی ہے 20:118)۔ اس معاہدہ کے بعد، وہ اپنی اور اپنے متعلقین کی ضروریاتِ زندگی کی طرف سے مطمئن ہوجاتے ہیں، اور نظامِ خداوندی کے اِستحکام کی خاطر، عندالضرورت، جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ جنگ میں نکل آتے ہیں۔ پھر، یا تو دشمن کو قتل کر کے فاتح و منصور واپس آتے ہیں، اور یا خود اپنی جان دے دیتے ہیں۔ اور، مرنے کے بعد، جنت کی زندگی حاصل کر لیتے ہیں۔

یہ معاہدہ کوئی نئی بات نہیں۔ یہ سابقہ آسمانی کتابوں —— تورات و انجیل —— میں بھی مذکور تھا، اور اب اسی کی تجدید، قرآن میں کی گئی ہے۔ اس عہد کا پورا کرنا اللہ نے خود اپنے ذمے لے رکھا ہے۔ اور، یہ ظاہر ہے کہ اللہ سے بڑھ کر، اپنے عہد کو پورا کرنے والا، کوئی نہیں۔ سو (اے جماعتِ مومنین) تم اس سودے پر، جو تم نے نظامِ خداوندی سے کیا ہے، خوش ہوجاؤ۔ اس لئے کہ یہی زندگی کی سب سے بڑی کامرانی ہے۔

نبی کریم ﷺ اور ان کے ساتھیوں رضی اللہ عنہم نے ایتائے زکوٰۃ کے بارے میں قرآنِ کریم کے مندرجہ بالا و دیگر احکامات پر پورا عمل کر کے ایسا اُسوۂ حسنہ پیش کیا ہے جو رہتی دنیا تک نوعِ انسانی کے لئے بہترین نمونہ کا کام دے گا۔

بریگیڈیئر اعزاز الدین احمد خان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ایہہ پُتر ہٹاں تے نئیں وکدے

''یہ لوگ ہیں جو دین کی حفاظت کی خاطر سربکف میدانِ جنگ میں نکل آتے ہیں اور پھر اس طرح صفوں میں جم کر لڑتے ہیں گویا سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔(61:4)''

جنگ 1971ء کا سچا واقعہ

کہتے ہیں تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ پتہ نہیں دیگر اقوام کے معاملہ میں یہ مقولہ کس حد تک صحیح ثابت ہوا ہو، لیکن جہاں تک پاکستان اور ہندوستان کے مابین جنگوں (1948ء، 1965ء، 1971ء)، اور آج کل کی ''خاموش'' جنگ، کے معرکہ حق و باطل کا تعلق ہے، پوری دنیا نے، جس میں اپنے اور بیگانے سب شامل ہیں، اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ تاریخ نے واقعی اپنے آپ کو دہرایا۔ افواجِ پاکستان کی حریت و شجاعت، سرفروشی اور غیرتِ ایمانی کے جوشاہکار محسوس و مشہود طور پر، ان جنگوں میں ابھر کر سامنے آئے ان کا تذکرہ عہدِ رسولؐ اللہ والذین معہٗ کی تاریخ میں تو ملتا ہے لیکن بعد میں کبھی سامنے نہیں آئے۔ مستقبل کا مؤرخ جب ان جنگوں کا تجزیہ کرے گا تو وہ جاننا چاہے گا کہ وہ کون سی قوّت تھی، وہ کونسا جذبہ تھا جس نے اہلِ پاکستان اور ان کی افواج کے پائے استقلال میں، ناسازگار حالات کے باوجود، ذرا سی لغزش بھی نہ آنے دی ہندو کے پاس تو بھارت ماتا کا سلوگن تھا۔ وہ وطن کے نام پر جنگ لڑ رہے تھے۔ کیا پاکستان کے مسلمانوں نے بھی مادرِ وطن کی خاطر جانیں لڑائی تھیں؟

دین اور وطن:

یاد رہے کہ اقوامِ عالم کے پیشِ نظر ''وطن'' سے بلند کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ یہی ان کی اُمیدوں کا مرکز اور ان کی تمناؤں کا محور ہوتا ہے۔ اس کی خاطر وہ جیتے اور اس کی خاطر مرتے ہیں۔ اس کے نام پر وہ قوم کے جذبات کو مشتعل کرتے اور اس کے تحفظ کے لئے وہ ان سے قربانیاں مانگتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ مادی نظریۂ حیات کی رُو سے طبعی وجود (Physical Existence) سے بلند کوئی مقصد ہوتا ہی نہیں، اور چونکہ اس کے لئے ''وطن'' ناگزیر ہے، اس لئے ان کے نزدیک وطن ہی

زندگی کا منتہائے مقصود ہے۔

لیکن ایک مسلمان کے نزدیک وطن مقصود بالذات نہیں، بلکہ وہ ذریعہ ہے، دین کی حفاظت کا۔ ہمیں اپنا وطن عزیز ہے اس لئے کہ اس کے اندر رہتے ہوئے ہمارا دین محفوظ رہتا ہے۔ اگر وطن ہی مقصود بالذات ہو، یہ دین کی حفاظت کا ذریعہ نہ ہو، تو پھر ہم میں اور دنیا کی دیگر قوموں میں کیا فرق رہا۔ اگر وطن ہی مقصود بالذات ہوتا تو ہمیں الگ خطۂ زمین حاصل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وطن تو ہندوستان بھی تھا۔ لیکن اس غلام وطن میں ہمارا دین محفوظ نہیں تھا۔ اس لئے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا۔ اب پاکستان کی حفاظت ہمارے ایمان کا جز ہے، اس لئے کہ اس وطن کے محفوظ رہنے سے ہمارا دین محفوظ رہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہمارے نزدیک مقصود بالذات دین ہے۔ یہ ہے بنیادی فرق ہمارے اور کافر (ہندو) کے نقطۂ نگاہ میں۔ ضرورت پڑنے پر دین کی خاطر۔ اس کے قیام، استحکام وحفاظت کی خاطر ___ جان کی بازی لگا دینے کو قرآنِ حکیم نے قتال فی سبیل اللہ سے تعبیر کیا ہے۔

قتال فی سبیل اللہ:

آیت (4:76) میں آیا ہے: اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ۚ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ الطَّاغُوۡتِ۔ ''ایمان والے ہمیشہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ کفار، طاغوت کے لئے جنگ کرتے ہیں۔''

''طاغوت'' ہر وہ قوت یا نظام ہے، جو قوانینِ حق وصداقت سے سرکشی اختیار کرے، دنیا میں اپنی من مانی کرے ہندو پاک جنگوں میں ہندوستان نے اپنی من مانی کرنے کی کوشش ہی تو کی تھی اور اب بھی کر رہا ہے، یہ جنگیں قتال فی سبیل اللہ اور قتال فی سبیل الطاغوت کی بہترین مثالیں ہیں۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ کون کس مقصد کے لئے جنگ کر رہا ہے۔

لیکن قتال فی سبیل اللہ ہو یا قتال فی سبیل الطاغوت۔ وطن کی حفاظت واستحکام کا جذبہ دونوں میں مشترک ہوتا ہے۔ اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ اگر ہم نے اپنے اُن سپاہیوں کو جنہوں نے ہند و پاک جنگوں میں جان کا نذرانہ پیش کیا، شہیدِ وطن کہہ کر پکارا، تو ہندو نے بھی اپنے وطن کے لئے جان دینے والے (نائیک عبدالحمید، جنگ 1965ء) کو شہیدِ وطن قرار دے کر ملک کے سب سے بڑے اعزاز سے نوازا۔ جو چیز قتال فی سبیل اللہ کو قتال فی سبیل الطاغوت سے متمیز کرتی ہے، وہ یہ جذبہ ہے کہ وطن کی حفاظت اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ ہماری جان، مال، عزت، آبرو کا محافظ اور ہماری اجتماعی قوت کا مرکز ہے اور ہماری جان، مال، عزت اور قوّت کا تحفظ ضروری ہے تاکہ یہ مستقل اقدارِ خداوندی۔ الدین۔ کی حفاظت اور تنفیذ کا ذریعہ بنیں۔

یہی وہ حقیقت ہے جسے ابھار کر سامنے لانے کے لئے قرآنِ حکیم نے کہا ہے کہ تم اپنے وطن کی سرحدوں کو فوجی چھاؤنیوں سے مستحکم بنائے رکھو۔ تُرۡہِبُوۡنَ بِہٖ عَدُوَّ اللّٰہِ وَ عَدُوَّکُمۡ (8:60) تاکہ اس سے ان لوگوں کے دِل میں خوف طاری رہے ''جو تمہارے دشمن بھی ہیں اور اللہ کے بھی دشمن۔'' ''تمہارے دشمن'' سے وطن کی وہ حیثیت سامنے آتی

ہے، جس کے استحکام کے ساتھ اس خطۂ زمین کے اندر رہنے والوں کی جان، مال، عزت، ناموس کی حفاظت وابستہ ہے اور ''اللہ کے دشمن'' سے وطن کی دوسری حیثیت سامنے آتی ہے۔ وہ یہ کہ یہ ہمارے دین کے تقاضوں کے پورا کرنے کا ذریعہ ہے۔ مسلمان کے نزدیک، یہ دونوں حیثیتیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کی جاسکتیں۔ اس لئے کہ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ:

ہم تو جیتے ہیں کہ دُنیا میں ترا نام رہے غیر ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے

جام کی گردش کے لیے ساقی کا رہنا ضروری ہے اور ساقی، اُس وقت تک ساقی ہے جب تک جام موجود ہے۔ پاکستان کے حصول میں اس کی یہ دونوں حیثیتیں سامنے تھیں اور اب اس کی حفاظت اور استحکام کے لئے بھی اس کی یہ دونوں حیثیتیں پیشِ نظر رہنی چاہئیں۔ وطن بچاؤ۔ اس لئے کہ دین محفوظ رہے۔ وطن کی حفاظت کرو تاکہ اس کے ذریعے دین کی حفاظت ہو۔ یہی وہ مقصد ہے جو خندقوں میں بیٹھ کر، چنے کی ایک مٹھی پر گزارا کر کے، آگ اور خون کے سیلاب بلاخیز کو روکنے والے مردانِ کارساز کی حیرت انگیز استقامت کا سبب بنتا ہے اور نازک لمحات میں بڑے بڑے معجزے کر دکھاتا ہے۔

مقصد کی صداقت و محکمیت پر یقین:

جو مقصد حق و صداقت پر مبنی ہو، اس کی محکمیت پر یقین (جسے ایمان کہتے ہیں) انسان کی نگاہ کا زاویہ بدل دیتا ہے، اور زاویۂ نگاہ کے بدل دینے سے انسان کے اندر جو نفسیاتی تبدیلی پیدا ہوتی ہے اس سے وہ (گویا) دوسرا انسان بن جاتا ہے۔ اس ایمان کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی وقت طاغوتی قوتوں کے خلاف جنگ ناگزیر ہو جائے تو یہ شخص (یا قوم) الدین کی حفاظت (قتال فی سبیل اللہ) کے لیے اپنا سب کچھ بلا تامل، قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص کا تو نعرہ ہی یہ ہوتا ہے۔ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (6:162) ''میرے تمام فرائض زندگی اور اس کے ادا کرنے کے طریقے، میرا مرنا اور میرا جینا، اللہ کے دین کی حفاظت اور تکمیل کے لئے وقف ہے۔'' یہی مسلمان کا صحیح نعرہ ہے۔

ایہہ پُتر ہٹاں تے نئیں وکدے:

اور یہی نعرہ ہماری فوج کے افسران اور جوانوں کا اوڑھنا اور بچھونا ہے۔ اُن کے پیشِ نظر ایک ہی مقصد ہوتا ہے: وطن کی حفاظت کرو تاکہ اس کے ذریعے دین کی حفاظت ہو۔ اس بلند مقصد کے حصول کی خاطر، ہماری فوج کے جوان مرد، عندالضرورت جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ جنگ میں نکل آتے ہیں۔ پھر یا تو دشمن کو برباد کر کے، فاتح و منصور واپس آتے ہیں، اور یا خود اپنی جان دے دیتے ہیں (9:111) اور میدانِ جنگ میں حریت و شجاعت، سرفروشی و مردانگی کے ایسے کارنامے اپنے خون سے رقم کر آتے ہیں جن پر خود تاریخ فخر کرتی ہے۔ یہی تو وہ جانباز ہیں جن کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے کہا ہے:

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

علامہ اقبالؒ کے نزدیک، تعینِ مقصد کے بعد، اس کے حصول کے لئے جدوجہد کا نام خودی ہے ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے، بھروسا مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم (مرحوم) نے ہندو پاک کی جنگوں کے شہیدوں اور غازیوں کو خراجِ تحسین یوں پیش کیا ہے:

ایہہ پُتر ہٹاں تے نئیں وکدے کیہہ لبھنی ایں وچ بازار کُڑے
ایہہ سود نقد وی نئیں ملدا توں لبھدی پھریں اُدھار کُڑے

پھر خود ہی بتاتے ہیں کہ جذبۂ ایمانی سے سرشار قوم کے یہ ''پُتر'' (بیٹے) اللہ کی دین ہیں فرماتے ہیں:

ایہہ دَین ہَے میرے داتا دی نہ اینویں ٹکراں مار کڑے

یہ بازار میں نہیں بکتے۔ یہ بڑی محنت سے تیار کئے جاتے ہیں۔ ان کی تربیت کا آغاز آغوشِ مادر میں ہوتا ہے قرآن کریم جس قسم کی قوم (جماعتِ مومنین) متشکل کرنا چاہتا ہے اس کے لئے اس نے امت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اُمت کا لفظ اُم سے بنا ہَے جس کے معنی ''ماں'' ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امت کی تعمیر آغوشِ مادر سے ہوتی ہے۔ پیدائش کے لحاظ سے بچہ صرف گوندھی ہوئی مٹی ہوتا ہے، ماں اسے جس قسم کے قالب میں چاہے ڈھال سکتی ہے۔ اگر ایک ماں نوعِ انسان کے اس انبوہِ کثیر میں ایک ایسے فرد کا اضافہ کردے جس پر انسانیت ناز کرے تو وہ یقیناً ایک عظیم ماں ہوگی۔ لیکن یہ اُس وقت تک ممکن نہیں ہوگا جب تک وہ قرآن حکیم سے راہنمائی حاصل نہ کرے کیونکہ انسانیت کی تشکیل صرف قرآن کے قالب میں ہوسکتی ہَے۔

قرآن کے قالب میں ڈھالے گئے ایسے نوجوانوں پر جب فوجی تربیت کا رنگ چڑھتا ہے تو یہ، حالتِ جنگ میں، بڑے سے بڑے دشمن کے آگے ''بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ'' (61:4) سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جاتے ہیں، تاکہ دشمن کو، ہر قیمت پر تباہ و برباد کیا جاسکے۔ بقول صوفی تبسم: یہ وہ ''پُتر'' ہیں۔ جن کے محیرالعقول کارناموں سے پاکستان کی فوج کی تاریخ بھری پڑی ہَے۔

پنجاب رجمنٹ کا جوان:

ایسے ہی ایک جوان (فوجی اصطلاح میں ''جوان'' سپاہی کو کہتے ہیں) کی سرگزشت سنئے جس نے اپنا وعدہ پورا کر کے نہ صرف اپنی ماں کی تربیت کا حق ادا کردیا بلکہ اپنے عمل سے یہ بھی ثابت کردکھایا کہ اگر مقصد کی صداقت پر یقین ہو تو انسان کیا کچھ نہیں کر گزرتا۔ پاکستان فوج کی مشہور و معروف، دوسو سال پرانی پلٹن، 4 پنجاب رجمنٹ کے اس جوان نے یہ ثابت کردکھایا کہ جب انسان کسی متاعِ عزیز کے تحفظ کی خاطر خطرات کا سامنا کرتا ہے اور یہ فیصلہ کرلیتا ہے کہ مجھے اس کی حفاظت کرنی ہے خواہ اس کے لئے مجھے اپنی جان تک بھی کیوں نہ دینی پڑے، تو اس کی خوابیدہ قوتیں یک لخت بیدار ہوجاتی ہیں اور اس سے ایسے کارنامے سرزد ہوجاتے ہیں، جن پر اور تو اور وہ خود حیران رہ جاتا ہے کہ یہ کیسے ہوگیا۔ یہ واقعہ جواب اس عظیم پلٹن (4 پنجاب رجمنٹ) کی تاریخ کا حصہ بن گیا ہے، 1971ء کی ہندو پاک جنگ میں، چھمب (آزاد کشمیر) کے محاذ پر،

10 اور 11 دسمبر 1971ء کی درمیانی رات کو رونما ہوا۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ کہتا چلوں کہ آج کل میں اس نامور پلٹن کی تاریخ لکھ رہا ہوں جو دو سو سالوں پر محیط ہے۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ میں نے، اپنے مضمون کے لئے اس پلٹن کا انتخاب کیوں کیا ہے ویسے بھی پنجاب رجمنٹ سے میرا گہرا تعلق ہے۔ اس پلٹن کو میں نے، آج سے سینتیس سال پہلے، کمانڈ کیا تھا بعد میں مجھے اس کا اعزازی کرنل بننے کا شرف بھی حاصل ہوا اور اب مجھے اللہ کے فضل و کرم سے، یہ فخر حاصل ہے کہ یہ پلٹن میرے بیٹے لیفٹیننٹ کرنل طارق اعزاز کے زیرِ کمان ہے۔ باپ اور بیٹا ایک ہی پلٹن کے کمانڈنگ افسر! (مختلف وقتوں میں سہی) ایک ایسی تاریخی روایت ہے جو فوجی زندگی میں شاذ و نادر ہی دیکھنے یا سننے میں آتی ہے۔ اس پلٹن کی دو سو سالہ تاریخ میں بھی اس کی مثال نہیں ملتی۔

4 رجمنٹ نے اپنی دو سو سالہ تاریخ میں بڑے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ غلامی کا دور بھی اس کی تاریخ کا حصہ ہے، لیکن آزادی کے بعد، اس کی تاریخ کا رنگ ہی کچھ اور ہے اور کیوں نہ ہو۔ یہ آزادی اور حب الوطنی کا دور ہے۔ اسلام کے نام پر حاصل کئے گئے اس ملک کی حفاظت کا دور ہے تاکہ اس کی بنیاد، الدین، محفوظ رہے۔ یہ ''طاغوت'' کے خلاف جنگوں کا دور ہے، جس میں اس پلٹن کے نوجوانوں کے کارنامے جب سامنے آتے ہیں تو سر فخر سے بلند ہوجاتا ہے۔ اس پلٹن کے ایک نوجوان کا جو واقعہ سنا رہا ہوں وہ بظاہر ایک چھوٹا سا واقعہ ہے لیکن اس میں جو جذبہ کارفرما ہے وہ لہو کو گرما دیتا ہے۔ یہ 1971ء کی جنگ کا ایک سچا واقعہ ہے۔

جنگ 1971ء:

یہ حقیقت ہے کہ فوجی اعتبار سے ہم 1971ء کی ہندو پاک جنگ کے لئے تیار نہیں تھے۔ لیکن ہندو کی عیاری اور مجیب الرحمٰن کی ''میر جعفری'' نے مشرقی پاکستان میں، بغیر اعلانِ جنگ کے، ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے کہ مغربی پاکستان میں ''سیکنڈ فرنٹ'' کھولنا ہی پڑا۔ ہندوستان کی سیاسی اور فوجی قیادت کے نقطۂ نگاہ سے ''دو قومی نظریہ'' کو کھوکھلا ثابت کرنے اور 1965ء کی جنگ کا بدلہ چکانے کے لئے، اس سے بہتر کوئی اور موقعہ نہیں تھا۔ ہمارے نقطۂ نگاہ سے، اس وقت کے مخدوش حالات کے پیشِ نظر، جنگ نہیں، بلکہ سیاسی تصفیہ کی غرض سے ''وقت خریدنا'' صحیح پالیسی تھی۔ اس غرض کے لئے مضبوط، مدبرانہ سیاسی قیادت وقت کی اہم ضرورت تھی جو، جنرل یحییٰ، اس وقت کے صدر اور کمانڈر ان چیف، کے بس کی بات نہیں تھی۔ سنگین حالات کا ٹھنڈے دِل و دماغ سے مقابلہ کرنے کی بجائے، وہ ہندو کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس گئے اور اعلانِ جنگ کر دیا اور اس طرح ہندوستان کو مشرقی پاکستان میں اپنی فوجیں داخل کرنے کا موقع فراہم کر دیا۔ ہندو چاہتا ہی یہی تھا کہ اعلانِ جنگ کی پہل ہماری طرف سے ہو۔ پھر ہُوا یہ کہ مشرقی پاکستان میں ہندوستان کی فوج داخل ہوگئی، اور ادھر مغربی پاکستان میں، پاکستانی فوج نے مقبوضہ کشمیر میں پیش قدمی شروع کر دی۔

چھمب (آزاد کشمیر) کا محاذ:

جب 3 دسمبر 1971ء کو ہندو پاک کی تیسری جنگ چھڑی، تو 4 پنجاب رجمنٹ، 23 ڈویژن کے تحت چھمب محاذ پر پیش قدمی کے لئے تیار کھڑی تھی۔ حکم ملتے ہی 4 پنجاب رجمنٹ نے جنگ بندی لائن عبور کی اور دشمن پر ٹوٹ پڑی۔ دیکھتے ہی دیکھتے، 7 دسمبر 1971ء تک 23 ڈویژن نے نہ صرف چھمب پر قبضہ کرلیا بلکہ دریائے توی تک سارا علاقہ بھارتی فوج سے آزاد کرالیا۔ 4 پنجاب رجمنٹ نے اس پیش قدمی میں بڑا نمایاں کردار ادا کیا اور دشمن کی کئی اہم چوکیوں پر قبضہ کرلیا جس سے بھارتی فوجیوں کے پیر اکھڑ گئے۔

کمانڈر 23 ڈویژن، میجر جنرل افتخار جنجوعہ (ستارۂ جرات)، بھاگتے ہوئے دشمن کو سانس لینے کا موقعہ نہیں دینا چاہتے تھے، اس لئے انہوں نے III برگیڈ کو حکم دیا کہ 9 اور 10 ستمبر 1971ء کی درمیانی رات کو، دریائے توی کے دوسرے کنارے پر ایک ''برج ہیڈ'' (Bridge Head) بنائے۔ یعنی دریائے توی کے دوسرے کنارے پر اتنے بڑے علاقہ پر قبضہ کرے جس میں سے گزر کر ہماری ٹینک رجمنٹ دشمن کا پیچھا کر سکے۔ اس حملے میں بھی 4 پنجاب رجمنٹ کو پہلے کی طرح، اہم کردار ادا کرنا تھا۔ بلکہ یوں کہئے کہ اس حملے کی کامیابی کا انحصار، بہت حد تک، اس کے مجاہدوں کے عزم اور حوصلے پر تھا۔

حملے کے لئے تیاریاں زوروں پر تھیں کہ دسمبر 1971ء کی شام کو اطلاع ملی کہ ڈویژن کمانڈر، جنرل افتخار جنجوعہ، افسروں اور جوانوں سے ملنے کے لئے آگے آرہے ہیں۔ سب اپنے نڈر اور دلیر کمانڈر کے منتظر تھے کہ اطلاع آئی، کہ وہ نہیں آسکیں گے کیونکہ وہ اپنے ربِ حقیقی کے پاس چلے گئے ہیں! ان کا ہیلی کاپٹر، اترتے ہوئے ایک درخت سے ٹکرا گیا تھا جو ان کی شہادت کا باعث بنا۔ ''انا للہ وان الیہ راجعون'' اس مردِ مجاہد کی آخری خواہش، اس کے سوا کچھ اور نہ تھی کہ ''حملہ پلان کے مطابق کیا جائے تاکہ دشمن کو پیر جمانے کا موقعہ نہ مل سکے۔'' سب آنکھیں آشکبار تھیں لیکن کسی نے حوصلے کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

اپنے کمانڈر کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے 4 پنجاب اور 10 بلوچ رجمنٹ (III برگیڈ) نے وقت مقررہ پر دشمن پر، بھرپور حملہ کیا۔ دریائے توی میں اپنے ''گھوڑے دوڑا دیئے'' وہ گھمسان کا رن پڑا، الامان، الحفیظ۔

10 دسمبر 1971ء کا سورج جب طلوع ہوا تو 4 پنجاب رجمنٹ، کے مجاہد دریائے توی کے دوسرے کنارے سے سینکڑوں گز آگے نکل چکے تھے۔ دشمن کی 9 جاٹ رجمنٹ کا صفایا ہو چکا تھا۔ اس حملے کی کامیابی میں، 4 پنجاب رجمنٹ کے کمانڈنگ افسر لیفٹیننٹ کرنل رشید کا بڑا ہاتھ تھا۔ ایک بار جب حملہ رُک گیا تو کرنل رشید نے حاضر دماغی اور دلیری کا ثبوت دیتے ہوئے ایک انٹی ٹینک گن کو، خود، اپنی نگرانی میں دریائے توی کے پار لے گئے اور اس سے دشمن کے ان بنکروں (Bunkers) کو اڑا دیا جو حملے کو روکے ہوئے تھے۔ پھر کیا تھا، دشمن کی 9 جاٹ رجمنٹ، اپنا سب کچھ چھوڑ کر

بھاگ گئی۔ میدان 4 پنجاب رجمنٹ کے ہاتھ رہا، جس نے وقت ضائع کئے بغیر ''برج ہیڈ'' میں پوزیشنیں سنبھال لیں، تاکہ دشمن کے جوابی حملہ، اگر آئے، کا مقابلہ کیا جاسکے، اور اپنی ٹینک رجمنٹ کو، مرحوم جنرل کے پلان کے مطابق (Launch) آگے بھیجا جاسکے۔

اس معرکہ میں 4 پنجاب رجمنٹ کا گو خاصا نقصان ہوا۔ 26 مجاہدوں نے جامِ شہادت نوش کیا اور 62 زخمی ہوئے۔ لیکن اس کے افسروں اور جوانوں کے حوصلے ہمیشہ کی طرح بلند تھے۔ جو کارنامہ انہوں نے سرانجام دیا تھا اُسے دشمن نے بھی سراہا ''برج ہیڈ'' میں اپنی پوزیشنوں کو ترتیب دیتے ہوئے، جب کمانڈنگ افسر، دشمن کے ایک زخمی حوالدار کے قریب سے گزرے، تو انہوں نے رک کر اس کی خیریت دریافت کی۔ زخمی حوالدار نے بمشکل اپنی آنکھیں کھولتے ہوئے کہا:

صاحب! مبارک ہو آپ نے بھارتی فوج کی بہترین پلٹن کو مات دی ہے۔

کمانڈنگ افسر نے دِل ہی دِل میں زخمی دشمن کی اپنی پلٹن سے محبت کو سراہا اور کہا:

''جوان! تمہاری پلٹن کو پاکستان کی بہترین پلٹن نے مات دی ہے۔'' یہ سن کر زخمی حوالدار کے چہرے پر ایک اداس سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر کچھ توقف کے بعد بولا: ''صاحب ایک درخواست ہے۔''

کمانڈنگ افسر: ''ہاں کہو۔''

زخمی حوالدار: ''صاحب مجھے گولی مار دیں میں اس کرب اور اذیت کو مزید برداشت نہیں کرسکتا!''

کمانڈر افسر پہلے تو یہ درخواست سن کر ذرا چونکے اور پھر یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے:

''ہم قیدیوں کو مارا نہیں کرتے اُن کا دھیان رکھتے ہیں۔''

پلان بدل گیا:

وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور اپنی ٹینک رجمنٹ ابھی تک (Launch) نہیں ہوئی تھی۔ اس ٹینک رجمنٹ کو 4 پنجاب کی برج ہیڈ کی پوزیشنوں میں سے گزر کر، دشمن کی طرف بڑھنا تھا یہ دیکھتے ہوئے کہ دشمن 10 بلوچ رجمنٹ کے سامنے ابھی تک موجود تھا۔ اپنے ٹینکوں کا آگے بڑھنا اور بھی ضروری تھا لیکن کچھ نہیں ہوا۔ یہ خدشہ اب تقویت پکڑ رہا تھا کہ پلان تبدیل ہوگئی ہے۔ یہ خدشہ درست ثابت ہوا 10 دسمبر 1971ء کی سہ پہر کو حکم ملا کہ 4 پنجاب ''برج ہیڈ'' کی پوزیشنوں کو خالی کر کے دریائے توی کے پیچھے آجائے!! ناقابلِ یقین حکم! کمانڈنگ افسر نے برگیڈ کمانڈر سے رابطہ قائم کیا اور پُرزور الفاظ میں اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے ہوئے کہا، ''دشمن تو بھاگ رہا ہے۔ ہم ان کی گنوں اور ٹرکوں کو پیچھے جاتے دیکھ رہے ہیں۔ ہمیں تو آگے بڑھ کر اس کا پیچھا کرنا چاہئے لیکن ہمیں پیچھے ہٹنے کا حکم دیا جارہا ہے۔ کیوں؟ 4 پنجاب رجمنٹ نے جو کامیابی حاصل کی ہے اُسے Exploit کرنا چاہیئے تاکہ 10 بلوچ کے سامنے دشمن کا دباؤ کم ہو۔ پھر انہوں نے نہایت ہی جذباتی انداز میں کہا ''اللہ! ہمارے شہیدوں کے خون کو یوں رائیگاں نہ جانے دیجئے۔ میں کس منہ سے اپنے جوانوں کو پیچھے ہٹنے کا حکم دوں۔'' برگیڈ کمانڈر

نے انہیں بڑے تحمل سے سنا پھر صرف اتنا کہا: ''میں حکم کی تعمیل کر رہا ہوں۔ آپ بھی ایسا ہی کریں۔''! اور یہ بھی بتایا کہ انہیں جو اطلاعیں ملی ہیں ان کے مطابق دشمن ایک بڑے جوابی حملے کی تیاریاں کر رہا ہے جس میں ٹینک کے دستے بھی شامل ہیں اور چونکہ 10 بلوچ رجمنٹ کو ابھی تک خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے۔ اس لئے 4 پنجاب رجمنٹ کا ''برج ہیڈ'' میں رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اس لئے آپ کو واپس آنے کے لئے کہا جا رہا ہے۔ صاف عیاں تھا کہ جنرل افتخار کی شہادت کے بعد لڑائی کا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ ایک دن پہلے جوڑیاں تک کا علاقہ ہمارے قدموں میں تھا اور دوسرے دن بہت دُور!

4 پنجاب رجمنٹ کے کمانڈنگ افسر نے، دل پر پتھر رکھ کر، پلٹن کو پیچھے ہٹنے کا حکم دے دیا Withdrawal دشمن کی گولہ باری کے باوجود، خیر وخوبی سے مکمل ہوا۔ یہ 10 دسمبر کی رات تھی۔

سپاہی کا وعدہ:

دریائے توی کے دوسرے کنارے پہنچ کر جب جوانوں کی پڑتال کی گئی تو پتہ لگا کہ سپاہی غلام رسول، جس کے پاس راکٹ لانچر تھا، واپس نہیں آیا ہے (راکٹ لانچر، پلاٹونوں کی سطح پر ٹینک مار ہتھیار ہے) متعلقہ کمپنی کمانڈر نے سپاہی غلام رسول کے پلاٹون حوالدار کو حکم دیا کہ وہ دو سپاہی ساتھ لے کر واپس ''برج ہیڈ'' پوزیشنوں میں جائے اور غلام رسول کو ڈھونڈ کر واپس لائے۔ حوالدار اور اس کے ساتھیوں نے، ایک بار پھر، برستی آگ میں، دریائے توی کو عبور کیا۔ دیکھ بھال کرتے ہوئے جب وہ ''برج ہیڈ'' میں اپنی سابقہ پوزیشنوں میں پہنچے، تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ سپاہی غلام رسول، اپنے راکٹ لانچر کو تیار پوزیشن میں کئے ہوئے مورچے میں کھڑا ہے۔ اُسے اس حالت میں کھڑے دیکھ کر، حوالدار کے ذہن میں یہ خیال گزرا کہ کہیں غلام رسول کا دماغ تو نہیں چل گیا ہے کیونکہ کوئی شخص اپنے ہوش وحواس میں، اندھیری رات میں، ایک ایسے مقام پر اکیلا کھڑا نہیں ہوگا، جہاں ایک طرف تو دشمن کی وقفہ وقفہ سے گولہ باری ہو رہی ہو، اور دوسرے جہاں دشمن کے ٹینک اور سپاہی کسی وقت بھی آ سکتے ہوں۔ لیکن اس کا یہ خیال غلط نکلا۔ جیسے ہی وہ سپاہی غلام رسول کے مورچے کے قریب آیا تو اس سے پہلے کہ وہ اس سے کچھ پوچھے غلام رسول بولا:

''استاد! آپ کیوں آئے ہیں۔ میں اپنا کام کر کے خود ہی آ جاتا۔''

حوالدار: ''کیسا کام؟ پہلے تو یہ بتاؤ کہ تم اکیلے یہاں کر کیا رہے ہو؟''

سپاہی: ''میں اکیلا تو نہیں ہوں۔ اللہ میرے ساتھ ہے۔۔۔ میں دشمن کے ٹینکوں کا انتظار کر رہا ہوں۔ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ دشمن ٹینکوں سے جوابی حملہ کرنے والا ہے۔''

حوالدار: ''ہاں کہا تھا لیکن تم اکیلے کیا کر لو گے؟''

سپاہی: تھوڑی خاموشی کے بعد ''پلٹن واپس نہ جاتی تو میرا کام آسان ہوتا۔ لیکن اب تو یہ کام مجھے اکیلے ہی کرنا پڑے گا۔۔۔ میں اپنا وعدہ پورا کر کے ہی واپس جاؤں گا۔''

حوالدار: ''کیسا وعدہ۔۔۔؟''

سپاہی: پھر وہی خاموشی۔۔۔ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنے جواب کو تول رہا ہو۔ پھر آہستہ سے بولا ''ماں سے وعدہ۔''

حوالدار: ''ماں سے وعدہ۔۔۔؟''

سپاہی: ''ہاں، استاد، میری ماں مجھے بتایا کرتی ہے کہ اللہ کی راہ میں جنگ کرنے والے، یا تو دشمن کو قتل کر کے واپس آتے ہیں یا خود اپنی جان دے دیتے ہیں۔۔۔'' تھوڑی دیر خاموشی کے بعد ''میں نے اپنی ماں سے وعدہ کیا تھا کہ اس لڑائی میں، میں اپنے راکٹ لانچر سے دین کے ان دشمنوں کے ایک یا دو ٹینک ضرور برباد کر کے واپس آؤں گا!! میری ماں نے مجھے ڈھیر ساری دعائیں دی تھیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔ پھر کہنے لگا ''مجھے اپنا وعدہ پورا کرنے کے لئے اس سے بہتر موقعہ شاید ہی پھر ملے۔ اس لئے میں یہیں رک گیا تھا۔'' کچھ سوچ کر پھر بولا ''استاد! آپ واپس جائیں۔ میں آجاؤں گا۔ انشاء اللہ۔۔۔ اور اگر میں واپس نہ آیا تو میری ماں کو ضرور بتا دینا کہ میں نے اپنا وعدہ پورا کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔۔۔!!'' اس کی آواز پھر بھرا گئی۔

حوالدار یہ سب کچھ ایک سکتے کے عالم میں سن رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے تھے جن پر وہ قابو نہ رکھ سکا۔ جب اس نے اپنے جذبات کو سپاہی سے چھپانے کی کوشش کی تو اس کے سینے میں گھٹن سی محسوس ہونے لگی۔ اس نے اپنا ماتھا مورچے کی منڈیر پر رکھ کر اپنے جذبات کے سیلاب کو روکنے کی کوشش کی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جذبہ ایمانی سے سرشار ایسے نوجوانوں کا کون مقابلہ کر سکتا ہے۔ ان کے ساتھ تو اللہ ہوتا ہے اور اللہ کا بھلا کون مقابلہ کر سکتا ہے کچھ دیر بعد جب اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا تو اس کی نظر سپاہی غلام رسول پر پڑی، جو بدستور ٹکٹکی باندھے، اپنے سامنے یوں دیکھ رہا تھا، جیسے اس کا مطلوب، رات کی تاریکی کو چیرتا ہوا کسی لمحے اس کے سامنے آ کھڑا ہوگا!

حرفِ آخر:

یہ ہے ایک ہلکی سی جھلک ہمارے ان مجاہدوں کی جو ہماری جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کے محافظ ہیں۔ یہ ہیں وہ مردانِ کارساز جو ہمارے مکار بنیا فطرت دشمن کو ارضِ پاک سے دُور رکھے ہوئے ہیں۔ یہ ہیں وہ شیر دل نوجوان، جو آج ہماری آزادی اور ہماری غلامی، ہماری عزت اور ذلت کے درمیان روک بنے ہوئے ہیں۔ یہ قوم کے بڑے مہنگے بیٹے ہیں۔ ان کی قدر کیجئے!

بقول صوفی تبسم:

ایہہ پُتر ہٹاں تے نئیں وکدے

(مطبوعہ ماہنامہ طلوعِ اسلام، ستمبر 1994)

تسوید و تصحیح
محمد ارشد، سلیم اختر

پرویزؒ کا پیغام بچوں کے نام

پرویزؒ صاحب نے کچھ دروس ننھے بچوں کے لئے بھی ریکارڈ کرائے تھے۔ اس سلسلے کے تیسرے درس کی ٹرانسکرپشن مناسب ایڈیٹنگ کے بعد پیشِ خدمت ہے۔ اُمید ہے پسند آئے گی۔ (ادارہ)

السلام علیکم:

بیٹھو بیٹھو بچو! تیسرا سبق تمہارا شروع ہوتا ہے۔ تم سنو بچو غور سے سنو۔ دیکھو بچو جتنی چیزیں تمہیں باہر دنیا میں نظر آتی ہیں ان میں سے ہر چیز اپنا اپنا کام ٹھیک وقت کے اوپر کرتی رہتی ہے۔ تم نے دیکھا کہ سورج کس طرح اپنے وقت پر اُبھرتا ہے۔ اور وقت پر ڈوب جاتا ہے۔ سردی اور گرمی کے موسم، بہار اور خزاں کے موسم کس طرح اپنے اپنے وقت پر آتے ہیں۔ ہوائیں کس طرح اپنی اپنی سمت میں چلتی رہتی ہیں۔ دنیا کی ہر شے ہر وقت اپنے اپنے کام میں مصروف رہتی ہے۔

> ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا اسراف کہلاتا ہے۔ ا۔س۔ر۔ا۔ف اور قرآن شریف کہتا ہے کہ اسراف بڑی بُری چیز ہے ضرورت سے زیادہ یا بلا ضرورت کبھی خرچ نہیں کرنا چاہئے۔

اسلام یہ چاہتا ہے جس طرح وہ چیزیں ہر وقت اپنے کام میں لگی رہتی ہیں انسان بھی اسی طرح اپنے اپنے کام میں لگے رہیں۔ وہ کہتا ہے وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ (53:39) انسان اس چیز کو بطور اپنے حق کے لے سکتا ہے جس کے لئے وہ محنت کرتا ہے۔ کوشش کرے اور مفت میں بیٹھے بٹھائے کچھ نہیں ہوتا۔ جو بچہ محنت نہیں کرتا کوشش نہیں کرتا وہ امتحان میں پاس نہیں ہوسکتا۔ یہ بڑی ضروری چیز ہے کہ جس چیز کے اوپر ایمان رکھے اس کے لئے برابر کوشش کرے، اس کو جہاد کہتے ہیں۔ ہاں مسلسل کوشش کرتے چلے جانا۔ اس لئے کہ ایک مومن کی زندگی مسلسل جہاد کی زندگی ہے۔ جہاد کے معنی یہ نہیں ہیں کہ میدانِ جنگ میں جا کر انسان لڑائی لڑے اور

تلوار لے کر اٹھے۔ یہ بھی جہاد ہوتا ہے، ہم بتائیں گے تمہیں اس کی کب ضرورت پڑتی ہے۔ وہ بھی ضروری چیز ہے لیکن اس کو جہاد نہیں کہتے۔ جہاد کہتے ہیں کہ جن باتوں کے اوپر ہم یقین رکھتے ہیں جن پر ہمارا ایمان ہے یعنی قرآن شریف میں جو حکم دیا گیا ہے سیدھی سی بات ہے بچو، اس کے لئے برابر کوشش کرتے رہنا، اسے جہاد کہتے ہیں اور ایسا کرنے والے کو کیا کہتے ہیں تم بتاؤ۔ اسے کہتے ہیں مجاہد ٹھیک بات جہاد کرنے والے کو مجاہد کہتے ہیں۔

لو بھئی اب اس سے ایک بات آگے چلتی ہے کہ انسان کو چاہئے کہ زیادہ سے زیادہ محنت کرے جو زیادہ سے زیادہ محنت کرے گا وہ زیادہ سے زیادہ کمائی کرے گا لیکن اسے اس کمائی میں سے صرف اتنا خرچ کرنا چاہئے جتنی اس کی ضرورت ہے۔ ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا اسراف کہلاتا ہے۔ ا۔س۔ر۔ا۔ف اور قرآن شریف کہتا ہے کہ اسراف بڑی بُری چیز ہے ضرورت سے زیادہ یا بلا ضرورت کبھی خرچ نہیں کرنا چاہئے۔ اب تم پوچھو گے کہ اگر ایک شخص بڑی محنت کرتا ہے اور بہت کچھ کماتا ہے اور اس کی ضرورتیں تو بہت تھوڑے سے روپوں میں پوری ہو جاتی ہیں تو وہ باقی روپے کو کیا کرے۔ سنو قرآن شریف اس کے لئے کیا کہتا ہے تمہیں معلوم ہے کہ دنیا میں لاکھوں آدمی ایسے ہیں کہ جو بچارے اپاہج ہوتے ہیں وہ کام کاج نہیں کر سکتے بہت سے ہیں جو کمزور ہوتے ہیں وہ کام کریں بھی تو اتنا نہیں کما سکتے کہ جس سے اُن کا اور اُن کی بیوی بچوں کا پیٹ پالا جا سکے، کچھ لوگ بیمار ہو جاتے ہیں بعض لوگوں کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔ تم نے سنا ہے کہ ایک موٹر ٹکرائی اور ایکسیڈنٹ ہو گیا اس کو کہتے ہیں ایکسیڈنٹ (حادثہ)۔ بھئی حادثے ہو جاتے ہیں۔ یہ جتنے لوگ جو اس طرح سے بیچارے یا تو کام کرنے کے قابل نہیں رہتے یا اگر کام کرتے ہیں تو کام سے اتنا پیسہ کما نہیں سکتے جن سے ان کی ضرورتیں پوری ہوں ان کی ضرورتیں کون پوری کرے گا۔ ان کی ضرورتیں وہ لوگ پورا کریں گے کہ جن کی کمائی ان کی ضرورتوں سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی ضرورتوں کے مطابق روپے رکھیں اور جتنا زیادہ ہو وہ ان لوگوں کے لئے دے دیں جن کی محنت کی کمائی اُن کی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن شریف میں کہا ہے کہ یہ لوگ جو محنت کر کے اتنا کماتے ہیں وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (51:19)

> اللہ کی راہ میں خرچ کرنا۔ اللہ کی راہ کیا ہوئی۔ دنیا میں محتاجوں اور غریبوں اور ضرورت مندوں کی ضرورتوں کو پورا کرنا۔ یاد رکھو اس کا یہ مطلب نہیں ہے یہ موٹے مسٹنڈے بھیک منگے فقیر آ جاتے ہیں اور ڈنڈے لئے ہوئے دوہائی دیتے ہیں دروازوں پہ آ کر اس طرح مانگتے ہیں، ان کو نہیں دینا۔

ان لوگوں کی کمائی میں ضرورت مندوں کا حق ہے اور ان لوگوں کا حق ہے جو کمانے سے محروم رہ گئے ہیں۔ سمجھ گئے اس کو کہتے ہیں خدا کی راہ میں خرچ کرنا۔ تمہیں

معلوم ہے نہ کہ اللہ میاں کو تمہارے روپے کی ضرورت نہیں ہے اس نے ساری دنیا بنائی ہے ساری چیزیں اس کی ملکیت ہیں اس کو تو کسی کی محتاجی نہیں ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں اللہ میاں کی راہ میں خرچ کرنا۔ اس کے معنی ہوتے ہیں کہ ان لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرنا جو محنت کرنے کے قابل نہیں رہے یا محنت کرتے ہیں تو اتنا کما نہیں سکتے جس سے اُن کی ضرورتیں پوری ہوں بیمار ہیں، کمزور ہیں یا حادثہ ہوگیا ہے ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے

> ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کرنے کا جو انتظام کرنا ہے اسے کہتے ہیں نظامِ ربوبیت۔ اسلام کیا چاہتا ہے؟ نظامِ ربوبیت قائم کرنا۔ زیادہ سے زیادہ محنت کرنا اور اپنی ضرورت سے زیادہ جتنا بھی ہو اس کو ایک جگہ ایک انتظام کے ماتحت اکھٹا کرنا وہاں سے لوگوں کی ضرورتوں کا پورا کرنا۔

جو خرچ کیا جاتا ہے اسے کہتے ہیں انفاق فی سبیل اللہ۔

اللہ کی راہ میں خرچ کرنا۔ اللہ کی راہ کیا ہوئی۔ دنیا میں محتاجوں اور غریبوں اور ضرورت مندوں کی ضرورتوں کو پورا کرنا۔ یاد رکھو اس کا یہ مطلب نہیں ہے یہ موٹے مسٹنڈے بھیک منگے فقیر آجاتے ہیں اور ڈنڈے لئے ہوئے دوہائی دیتے ہیں دروازوں پہ آکر اس طرح مانگتے ہیں، ان کو نہیں دینا۔

وہ جو کمانے کے قابل نہیں ہیں یا محنت کریں اتنا کما نہ سکیں جس سے ان کی ضرورتیں پوری ہوں ان کو دینا ہے یہ ہے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ کسی کو جا کر ایک پیسہ، چار پیسے، دو پیسے، ایک روپیہ کسی کو دے آئیں اس طرح تو کسی کا بھی کام نہیں چلے گا ایسا انتظام کیا جائے جتنا کسی کے پاس اپنی ضرورتوں سے زیادہ ہے وہ ایک جگہ جمع ہوجائے اور جن لوگوں کی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں وہاں سے ان کی ضرورتیں پوری کی جائیں۔ اس طرح سے صحیح طریقہ سے اس دولت کو خرچ کرنا اسے کہتے ہیں نظامِ ربوبیت، ربوبیت کا لفظ سن لیا کیا معنی ہوئے ربوبیت کے؟ پرورش کرنا، نشوونما دینا۔ نظام کے معنی انتظام کرنا وہ جو انتظام کرنا ہے ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کرنے کا جو انتظام کرنا ہے اسے کہتے ہیں نظامِ ربوبیت۔ اسلام کیا چاہتا ہے؟ نظامِ ربوبیت قائم کرنا۔ زیادہ سے زیادہ محنت کرنا اور اپنی ضرورت سے زیادہ جتنا بھی ہو اس کو ایک جگہ ایک انتظام کے ماتحت اکھٹا کرنا وہاں سے لوگوں کی ضرورتوں کا پورا کرنا اسی کو حکومت کا نظام کہتے ہیں۔ اسلام کی حکومت کا نظام کیا ہوگا۔ نظامِ ربوبیت۔ لوگوں کی ضرروتوں کو پورا کرنے کے لئے انتظام کرنا اسے کہتے ہیں نظامِ ربوبیت۔ سمجھ گئے۔

اب بچو تم یہ پوچھو گے کہ ہم نے جو تمہیں بتایا ہے کہ ہر شخص کو چاہئے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق خرچ کرے۔ تو کیا مطلب ہے کم سے کم خرچ کرنے کا؟ کیا مطلب ہے میلے کچیلے کپڑے پہن کر رہیں زمین پر بیٹھیں جھونپڑیوں میں رہیں؟ نہیں صاف ستھرے کپڑے پہنیں

میز کرسی پر بیٹھیں، اچھا مکان بھی ہونا چاہئے، اچھا کھانے کو بھی ملنا چاہئے ایسا کھانا ملنا چاہئے جس سے صحت اچھی رہے، برقرار رہے۔ یہ سب چیزیں میسر ہوں قرآن کریم میں ہے:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ط (7:32)

اللہ نے اپنے بندوں کے لئے زیب و زینت کے لئے جو چیزیں بنائی ہیں وہ کون حرام قرار دے سکتا ہے؟ حرام نہیں ہیں، ان کا استعمال کرنا چاہئے۔ لیکن مطلب سارا یہ ہے کہ فضول خرچی نہیں کرنی چاہئے۔ اچھی طرح سے رہنا چاہئے۔

بڑی محنت سے کمائی کرنی چاہئے لیکن اس کے بعد جتنا زیادہ بچے وہ ان لوگوں کی ضرورت کے لئے دے دینا چاہئے کہ جن کی ضرورتیں ان کی محنت کی کمائی سے پوری نہیں ہوتیں۔ سمجھ لیا تم نے غرض کہ اچھی طرح سے رہنا چاہئے کھانا ایسا چاہئے کہ جس سے صحت قائم رہے، صحت کا قائم رکھنا بڑا ضروری ہے۔ یاد رکھو تمہیں ایک بات بتاتے ہیں قرآن شریف میں ہے کہ ایک دفعہ کسی قوم نے اپنے نبیؑ سے کہا کہ ہمارے اوپر ایک کمانڈر مقرر کردے، کمانڈر مقرر کیا تو انہوں نے کہا یہ کیسے مقرر کردیا یہ تو زیادہ مالدار آدمی نہیں ہے۔ ان سے کہا کہ کمانڈر بننے کے لئے کپتان بننے کے لئے مالدار ہونا ضروری نہیں ہے۔ جس کو کمانڈر بنایا گیا ہے اس میں دو چیزیں بہت اہم ہیں۔ سنو سنو بچو وہ کون سی دو چیزیں ہیں جن سے اسے اتنا بڑا کمانڈر بنا دیا گیا۔

قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ط (2:247) اس کو اللہ نے بہت علم دیا تھا اور اس کے ساتھ اس کی جسمانی طاقت بھی تھی۔ سمجھا تم نے کن دو چیزوں کی ضرورت ہے؟ علم بھی زیادہ ہو اور صحت بھی اچھی ہو۔ یاد رکھو بچو جن بچوں کی صحت اچھی نہیں ہوگی وہ کمزور رہ جائیں گے اور دنیا میں ترقی نہیں کرسکیں گے اس لئے تمہیں اپنی صحت کا بڑا خیال رکھنا چاہئے۔ خوب مضبوط جسم ہونا چاہئے، ورزش کرنی چاہئے، سیر کرنی چاہئے اپنی صحت کا خاص خیال رکھنا چاہئے۔ بڑی ضروری بات ہے اس لئے کہ علم کے ساتھ صحت کا ہونا، جسمانی طاقت کا ہونا بھی بڑا ضروری ہے۔ سمجھ لیا تم نے! لو بچو آج ذرا تمہارا سبق جلدی ختم ہوجائے گا زیادہ وقت ہوگیا تم دیر سے پہنچے تھے بھائی کل سے دیر سے نہ آنا ذرا وقت پر آجانا پھر ہم تمہیں بڑی اچھی اچھی باتیں سنائیں گے۔ بڑی عمدہ باتیں کل کے سبق میں آئیں گی۔ اچھا بیٹا السلام علیکم!

علم بھی زیادہ ہو اور صحت بھی اچھی ہو۔ یاد رکھو بچو جن بچوں کی صحت اچھی نہیں ہوگی وہ کمزور رہ جائیں گے اور دنیا میں ترقی نہیں کرسکیں گے اس لئے تمہیں اپنی صحت کا بڑا خیال رکھنا چاہئے۔ خوب مضبوط جسم ہونا چاہئے، ورزش کرنی چاہئے، سیر کرنی چاہئے اپنی صحت کا خاص خیال رکھنا چاہئے۔

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قانون سے استثناء

اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسانی کے لیے رزق اور ہدایت کی فراہمی اپنے اوپر لی ہے۔(87:3،11:1)اس طرح انسانوں کی طبعی ضروریات بھی پوری ہوتی رہیں، اور انسانیت کی ہدایت بھی ہوتی رہی۔ اسی وجہ سے شروع دن سے ہی اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کی بعثت کا سلسلہ جاری کیا اور بعثت انبیاء کے اس سلسلہ کو اللہ تعالیٰ نے انسانیت پر ایک احسان فرمایا ہے (3:164) ہر نبیؑ کے ساتھ ہدایت کا ایک آئین ودستور آتا تھا۔ ہر نبیؑ اس آئین ودستور کے مطابق ایک نظام قائم کرتا تھا۔ نبیؑ کے انتقال کے بعد اس کی وحی میں آمیزش ہوجاتی تھی، اور وہ نظام درہم برہم ہوجاتا تھا تو ایک نیا نبی اپنی وحی کے ساتھ مبعوث ہوتا تھا اور اس طرح اللہ تعالیٰ، اپنی وحی منزہ شکل میں پھر عطا کر دیتا تھا۔ شروع میں معاشرے سادہ ہوتے تھے۔ اس لئے اس نبی کی وحی میں اصول وجزئیات دونوں ہوتی تھیں۔ جوں جوں معاشرے ترقی کرتے گئے اصول زیادہ ہوتے گئے اور جزئیات کم ہوتی گئیں۔ جب انسانیت بالغ ہوگئی تو وہ کتاب عطا کی گئی جس میں اصول زیادہ تھے اور جزئیات ہر زمانہ کے معاشرے کے لیے چھوڑ دی گئیں، کہ ہر معاشرہ اپنی ضروریات کے مطابق جزئیات مقرر کرتا چلا جائے۔

> آخر وہ کیا وجہ ہے کہ عقل انسانی (ضمیر) خیر وشر (سیدھی راہ اور گمراہی) میں امتیاز نہیں کرسکتی قرآنِ کریم نے یہ ایک چیلنج دیا ہے اور اس کا یہ چیلنج برقرار ہے ارشاد ہوتا ہے۔ وَعَسٰۤی اَنۡ تَکۡرَہُوۡا شَیۡئًا وَّہُوَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ ۚ وَعَسٰۤی اَنۡ تُحِبُّوۡا شَیۡئًا وَّہُوَ شَرٌّ لَّکُمۡ ؕ وَاللّٰہُ یَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۱۶﴾ (2:216) ترجمہ: کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو اور اسی میں تمہاری بھلائی ہو، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تم جس چیز کو پسند کرتے ہو، اس میں تمہاری برائی ہو اور خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

یہ انبیاء کرامؑ صرف زبانی وعظ وتقریر نہیں کرتے تھے وَاَنۡزَلَ مَعَہُمُ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ (2:213) انہیں ضابطہ قانون دیا جاتا تھا جو حق پر مبنی ہوتا تھا۔ حکومتیں وہ بھی ہوتی ہیں جن میں انسانوں کا وضع کردہ قانون جاری ہوتا ہے۔ لیکن اس حکومت میں وہ قانون رائج ہوتا تھا جو حق پر مبنی ہوتا تھا۔ لِیَحۡکُمَ بَیۡنَ النَّاسِ فِیۡمَا اخۡتَلَفُوۡا فِیۡہِ ؕ وَمَا اخۡتَلَفَ فِیۡہِ (2:213) وہ کتاب لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو خود قانون سازی کی اجازت نہیں دی ہے بلکہ ہمیشہ ہر حکومت میں اللہ تعالیٰ کے عطا

کردہ قوانین انبیاء کرامؑ نے جاری فرمائے۔

سورۃ الحدید میں ارشادِ عالی ہے لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ (57:25) ہم نے اپنے رسول نشانیاں دے کر بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب اور ترازو اتاری تاکہ لوگ سیدھے انصاف پر رہیں۔ اس آیت میں بھی وہی بات دہرائی گئی ہے کہ انسانوں کے درمیان اختلافی معاملات کا فیصلہ نبی کی کتاب کے ذریعے ہوتا تھا، اور انسان خود قانون وضع نہیں کرتے تھے۔

سورہ مائدہ میں ارشاد ہے۔ اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا (5:44) ترجمہ: بے شک ہم نے تورات اتاری جس میں ہدایت اور روشنی ہے اسی کے مطابق خدا کے فرمانبردار انبیاءؑ ربانی علماء وفقہاء یہود کے معاملات کے فیصلے کرتے تھے۔ اس مقام پر تورات کی منزلت اور رفعت شان بیان کی گئی ہے کہ اس تورات کے سچے اور مخلص حاملین کی یہ روش رہی ہے کہ اللہ کے فرمانبردار نبی اس کے قوانین واحکام کے مطابق معاملات اور مقدمات کے فیصلے کرتے رہے تھے۔ اس آیت میں جو يَحْكُمُ کا لفظ آیا ہے اس سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ کتاب اللہ کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ زندگی کے معاملات اور تنازعات میں امر وحکم اور فیصلہ وقضا کا ذریعہ بنے اور تمام سیاسی وقانونی معاملات اس کے احکامات کے مطابق طے پائیں لیکن اگر اس کتاب کے مطابق زندگی کے مسائل کا فیصلہ نہ ہو، تو نہ صرف یہ کہ اس کتاب کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا بلکہ اگر اس کے احکام کے خلاف احکام بنائے جائیں تو یہ اللہ کی کتاب کے ساتھ مذاق ہے اور اس کی بے حد بے عزتی ہے۔

> اسلامی مملکت کا آئین قرآنِ کریم ہوتا ہے۔ حضور ﷺ کے دور میں یہی آئین تھا اور حضور ﷺ اس آئین کے مطابق فیصلے فرماتے تھے۔

جس طرح تمام سابقہ انبیاء کرامؑ کو قانون سازی کا حق نہیں تھا اور وہ اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ اسی طرح حضور ﷺ کو بھی قانون سازی کی اجازت نہیں تھی اور آپ کو بھی یہی حکم ہوا کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (5:48) ترجمہ: جو اللہ نے اتارا ہے تو آپ بھی اس کے مطابق فیصلہ کریں۔ حضور ﷺ کو یہی حکم دوبارہ دیا گیا کہ وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ (5:49) ترجمہ: ما انزل اللہ کے مطابق فیصلے کرو اور ان کی خواہشات پر نہ چلو۔ خود حضور ﷺ کا اپنا قول گرامی تھا مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآيِ نَفْسِيْ ۚ (10:15) ترجمہ: میرا یہ کام نہیں کہ اس (قانون) کو اپنی طرف سے بدل دوں۔

ہم نے یہ پانچ آیاتِ کریمات یہ بات ثابت کرنے کے لئے تحریر کی ہیں کہ قرآنِ کریم انسانوں کو حتیٰ کہ خود رسولوں کو بمع حضور ﷺ کے قانون سازی کی اجازت نہیں دیتا لیکن یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ آخر وہ کیا وجہ ہے کہ عقل انسانی خیر وشر میں امتیاز نہیں کرسکتی قرآنِ کریم نے یہ ایک چیلنج دیا ہے اور اس کا یہ چیلنج برقرار ہے ارشاد ہوتا ہے۔ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا

شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (2:216) ترجمہ: کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو اور اسی میں تمہاری بھلائی ہو، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تم جس چیز کو پسند کرتے ہو، اس میں تمہاری برائی ہو اور خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو قانون سازی کا حق کیوں نہیں دیا اس کی دوسری وجہ سورۂ مائدہ میں بیان فرمائی گئی ہے وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (5:44) ترجمہ: جو ما انزل اللہ کے مطابق فیصلے نہ کرے وہ کافر ہے۔ اس سے اگلی آیات میں انہیں ظالم اور فاسق کہا گیا ہے۔ قرآنِ کریم کے مطابق انسانوں کے وضع کردہ قوانین کفر، ظلم، اور فسق پر مبنی ہوتے ہیں جب بھی کوئی انسان کوئی قانون بناتا ہے اس میں کفر، ظلم اور فسق پایا جاتا ہے۔ محترم المقام جناب مولانا مودودی مرحوم نے ان آیات کی عقلی توجیہہ کی ہے جو بہت عمدہ ہے۔ آپ اس توجیہہ کو ملاحظہ فرمائیں۔ یہ اقتباس ذرا لمبا ہے ہم اس کے لئے معذرت خواہ ہیں۔ لیکن بہت توجہ کے قابل ہے۔

> غیر اسلامی معاشروں کے متعلق فرمایا ان کے ہاں ایک تو عام مجرم ہوتے ہیں، ایک اکابر مجرمین ہوتے ہیں یعنی مجرموں کے سرغنے یعنی بڑے بڑے مجرم لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ۭ پھر اپنے اعمال مزین بن کر ان کو دکھائی دیتے ہیں۔ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ۭ (6:122) وہ اس سے نکلنا نہیں چاہتے۔

''یہاں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے حق میں جو خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں تین حکم ثابت کئے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کافر ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ ظالم ہیں۔ تیسرے یہ کہ وہ فاسق ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو انسان خدا کے حکم اور اس کے نازل کردہ قانون کو چھوڑ کر اپنے یا دوسرے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین پر فیصلہ کرتا ہے۔ وہ دراصل تین بڑے جرائم کا ارتقاب کرتا ہے۔ اوّلاً اس کا یہ فعل حکم خداوندی کے انکار کا ہم معنی ہے اور یہ کفر ہے۔ ثانیاً اس کا یہ فعل عدل وانصاف کے خلاف ہے کیونکہ ٹھیک ٹھیک عدل کے مطابق جو حکم ہوسکتا تھا وہ تو خدا نے دے دیا تھا۔ اس نے جب خدا کے حکم سے ہٹ کر فیصلہ کیا تو ظلم کیا۔ تیسرے یہ کہ بندہ ہونے کے باوجود جب اس نے اپنے مالک کے قانون سے منحرف ہوکر اپنا یا کسی دوسرے کا قانون نافذ کیا تو درحقیقت بندگی کے دائرے سے باہر قدم نکالا، اور یہی فسق ہے۔ یہ کفر اور ظلم، اور فسق اپنی نوعیت کے اعتبار سے لازماً انحراف از حکم خداوندی کی عین حقیقت میں داخل ہوگیا۔''

قرآنِ کریم انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو سند نہیں کرتا وہ اس قانون کو recognize ہی نہیں کرتا۔ جب وہ حکم دیتا ہے کہ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ (5:8) تو اس سے اس کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قوانین کے مطابق عدل کیا جائے۔ قرآنِ کریم ایسی حکومت کے قیام کو ہر شخص پر فرض قرار دیتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے قوانین کے مطابق عدل کیا

جائے۔ قرآنِ کریم کے مطابق نہ صرف اقامت دین فرض ہے بلکہ غیر اسلامی نظام میں زندگی بسر کرنا جرم ہے (6:123)

ہمارا ایک مضمون موقر رسالہ طلوع اسلام میں طبع ہوا تھا ہم نے اقامت دین کی فرضیت کے متعلق اس میں تحریر کیا تھا:

''مومن وہ ہے جو قرآنِ کریم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ واحد، مکمل اور آخری ضابطۂ حیات خیال کرے۔ ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اس دنیا میں نظامِ الٰہی کے قیام کے لیے پوری پوری کوشش کرے۔ وہ جس ملک اور مقام میں بھی موجود ہو۔ وہیں اس جدوجہد کو شروع کر دے۔ کیونکہ نظامِ الٰہی کسی خاص مقام یا کسی خاص دور سے مختص نہیں اس کی پوری پوری کوشش یہی ہو کہ تمام نظام ہائے باطل کو اکھیڑ کر پھینک دے اور اللہ کی زمین پر صرف اور صرف اللہ کے قانون اور نظام کو جاری کر دے۔ اس لئے کہ اسی نظام کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہے اور جو لوگ اللہ و رسول کی اطاعت کرنا چاہتے ہوں اُن کے لیے از بسکہ ضروری ہے کہ ان کا دیا ہوا نظام جاری کریں جو لوگ اللہ و رسول کے نظام کے علاوہ کسی بھی نظام کے تحت زندگی بسر کرنے پر رضامند ہوں، وہ اللہ و رسول کے باغی اور نافرمان ہیں۔ خواہ وہ کتنے ہی نماز و روزہ کے پابند ہوں غیر اسلامی نظام میں زندگی بسر کرنا جرم ہے (6:23) اور غیر اسلامی نظام میں جس قدر رزق حاصل ہوتا ہے وہ قطعاً حرام ہوتا ہے، اور اس رزق کا ایک ایک لقمہ حرام ہے۔ موقر رسالہ ترجمان القرآن بابت دسمبر 2011ء میں ایک مضمون اقامتِ دین فرض ہے'' طبع ہوا تھا۔ یہ مضمون بہت عمدہ ہے اور اپنے عنوان کی نسبت سے اس درجہ عمدہ ہے کہ آنکھوں کو لگانے کو دل چاہتا ہے۔ اس موضوع پر اس کے تین اقتباسات پیش خدمت عالی ہیں۔

''اقامتِ دین تمام فقہائے اسلام کے نزدیک متفقہ اور مسلمہ فریضہ ہے۔ اس میں اختلاف اور تفرقہ حرام ہے۔ جس طرح دین کی تبلیغ ہماری ذمہ داری ہے۔ یہ ذمہ داریاں ہم نے از خود نہیں لیں بلکہ ربّ کائنات جس نے ہمیں عدم سے وجود بخشا وہ ہمارا مالک و حقیقی ولی ہے۔ وہی اس کا حق رکھتا ہے کہ وہ انسانی پیدائش کا مقصد بتائے اور اس کے لیے ضابطہ و قانون بتائے۔ اس نے ہمیں انبیاءؑ کا وارث قرار دیا ہے۔ اس نے انبیاءؑ کی بعثت کا مقصد اقامت دین قرار دیا ہے۔ حضور ﷺ کے بعد اب کوئی نیا نبی نہیں آئے گا۔ لہٰذا یہ فریضہ امت مسلمہ کے سپرد کیا گیا ہے۔ اس طرح از خود اقامتِ دین ہماری زندگی کا مقصد بن جاتا ہے۔ مقصد زندگی قرار دینے کے بعد یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے مقصد زندگی کا صحیح شعور حاصل کریں اور اس کے مطابق اپنے اندر مطلوبہ اخلاق، اوصاف اور استعداد پیدا کریں۔''

2۔ ایسے تمام نصوص قرآنی سے بطورِ اقتضا، اسلامی حکومت کے قیام کی فرضیت ثابت ہوتی ہے اور مسلم معاشرے کے تمام افراد پر اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوشش کرنا بحد استطاعت فرض ہے اور استطاعت کے باوجود اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوشش نہ کرنا ویسے ہی گناہ ہے جیسے صاحبِ استطاعت مسلمان پر روزہ، نماز، زکوٰۃ، حج، فرض ہے اور ان فرائض کو ترک کرنا عاقبت کو برباد کرنا ہے۔

3۔ حکومت اگر اللہ کے قانون پر مبنی ہے اور اس کا حکم جاری کرتی ہے، تو اس کی اطاعت فرض ہے اور اگر ایسی حکومت نہیں ہے تو اس کی اطاعت جرم ہے۔

ان چار اقتباسات سے آپ کو اقامتِ دین کی فرضیت کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔

سورۃ الانعام میں ارشادِ عالی ہے وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ (6:123) ترجمہ: اور ہم نے اسی طرح ہر بستی میں گنہگاروں کے سردار کئے کہ فریب کیا کریں اور جو حیلے یہ کرتے ہیں وہ اپنی جان پر کرتے ہیں، لیکن یہ جانتے نہیں۔ قرآنِ کریم قوموں کے تباہ ہونے کا سبب بیان کرتا ہے کہ غیر اسلامی نظام میں زندگی بسر کرنے والا ہر شخص مجرم ہوتا ہے، البتہ ان کے لیڈر ''اکبر المجرمین'' یعنی مجرموں کے سردار ہوتے ہیں۔ قرآنِ کریم ان معاشروں کی قومی اسمبلی، صوبائی اسمبلی کے ممبران وزراء، مشیر سب کو اکابر مجرمین، یعنی مجرموں کا سردار کہتا ہے۔ ان غیر اسلامی معاشروں کے متعلق فرمایا ان کے ہاں ایک تو عام مجرم ہوتے ہیں، ایک اکابر مجرمین ہوتے ہیں یعنی مجرموں کے سرغنے یعنی بڑے بڑے مجرم لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ پھر اپنے اعمال مزین بن کر ان کو دکھائی دیتے ہیں۔ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ (6:122) وہ اس سے نکلنا نہیں چاہتے۔ اگر ایک مرتبہ وزیر یا وزیر اعظم بن گئے تو اس کرسی کو چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتے۔

> اسلامی مملکت مقصود بالذات نہیں ہوتی اس کے احکامات کی اطاعت سے تزکیہ نفس ہوتا ہے (2:286)

اسلامی مملکت کا آئین قرآنِ کریم ہوتا ہے۔ حضور ﷺ کے دور میں یہی آئین تھا اور حضور ﷺ اس آئین کے مطابق فیصلے فرماتے تھے۔ انسانوں کے بنائے ہوئے آئین غیر اسلامی مملکت میں جاری ہوتے ہیں۔ قرآن کے مطابق انسانوں کے بنائے ہوئے آئین کی ایک ایک شق، اس کا ایک ایک آرٹیکل کفر، ظلم اور فسق پر مبنی ہوتا ہے۔ اس آئین کے متعلق قرآن فرماتا ہے مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ (7:71) ترجمہ: اللہ نے اس کے لئے کوئی سند نہیں اتاری۔ ہم خود ہی اپنے نظام بناتے ہیں۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد وہ ہمارے نزدیک مقدس بن جاتا ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ مقدس نہیں ہوتا انسان، انسان سب برابر ہیں۔ کسی کو کسی پر فوقیت و برتری نہیں ہے۔ ایک انسان کی بنائی ہوئی کوئی چیز دوسرے انسان کے لیے مقدس نہیں ہوسکتی۔ قرآنِ کریم کے نزدیک تقدس کا صرف ایک معیار ہوتا ہے اور وہ ہے مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ ۔۔۔ اس کے تقدس کے لیے اللہ نے کوئی سند اتاری ہو۔ قرآنِ کریم نے یہ بات واضح فرما دی کہ کسی چیز کی قدر و منزلت کے پرکھنے کا صحیح معیار وہ سند ہے جو منزل من اللہ ہے۔ ہر شے کو میزانِ خداوندی میں رکھنا ضروری ہے۔ دلیل اور حجت اس آسمان کے نیچے صرف ایک ہی ہے یعنی ما انزل اللہ جو اللہ نے نازل کی۔

غیر اسلامی نظام اور انسانوں کے وضع کردہ آئین اور اس نظام کے اکابرین کی جو اصل حقیقت ہے وہ آپ کے سامنے پیش کر دی گئی ہے۔ اس کے بعد اس آئین سے استثناء کے متعلق معلوم کرنا ایک مضحکہ خیز بات ہے۔ ایک نظام ہی باطل ہے۔ دوسرے، معصیت الٰہی پر قائم ہے۔ اس میں استثناء حاصل کرنا بھی باطل ہے۔ حرام کی کمائی کا ایک ایک لقمہ حرام ہوتا ہے۔ البتہ اسلامی آئین یعنی قرآنِ کریم کے مطابق کسی شخص کو قانون سے استثناء حاصل نہیں ہوسکتا۔ اسلامی مملکت میں سب سے بڑا

مرتبہ اور مقام حضور ﷺ کا ہے۔ حضور نے اپنی ذمہ داری کے متعلق فرمایا: اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ ؕ (6:50) ترجمہ: میں تو ان ہی احکام کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے ایک اور مقام پر ارشاد عالی ہے اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ ۚ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اِنۡ عَصَیۡتُ رَبِّیۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ﴿۱۵﴾ (10:15) میں تو ان ہی احکام کی ہمسری کرتا ہُوں جو میری طرف وحی کئے جاتے ہیں، مجھے اندیشہ ہے بڑے دن کے عذاب کا اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں۔

اصل یہ ہے کہ اسلامی مملکت مقصود بالذات نہیں ہوتی اس کے احکامات کی اطاعت سے تزکیہ نفس ہوتا ہے (2:286) صفاتِ خداوندی کا یہ تقاضہ ہے کہ ان پر عمل کیا جائے اور معاشرہ میں ان کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جائے اللہ تعالیٰ ربّ ہے۔ کائنات اور کائنات میں رہنے والے ہر فرد کی ربوبیت کرتا ہے اس کی اس صفت کا یہ تقاضہ ہے کہ اس کی اس صفت کو خوب فروغ دیا جائے۔ اس نے انسان کو پیدا ہی اس لئے کیا کہ اس کی صفات پر عمل کیا جائے۔ اسلامی مملکت کے قیام کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اسلامی مملکت صفاتِ خداوندی کو رائج کرتی ہے۔ اس وقت ہم اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات عالیہ پر صرف ایمان لائے ہوئے ہیں۔ اسلامی مملکت اس کو عملاً جاری کرتی ہے وہ صفات اسلامی مملکت کو چاروں طرف سے گھیر لیتی ہیں۔ اس طرح یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات کے ساتھ اس دنیا میں جلوہ گر ہو گیا ہے۔ اور زمین اللہ تعالیٰ کے نور سے چمکنے لگتی ہے۔ اسلامی مملکت کے حکام کو اللہ تعالیٰ نے حاملین عرش الٰہی کہا ہے۔ خارجی کائنات میں جو وسائط و ذرائع نظم و نسق قائم رکھتے ہیں اور خدا کے پروگرام کے مطابق سرگرم عمل رہتے ہیں، اُنہیں ملائکہ کہا جاتا ہے لیکن جب انسانی دنیا میں حکومتِ خداوندی قائم ہوتی ہے تو جو لوگ اس حکومت کے قیام و استحکام کے ذمہ دار ہوتے ہیں وہ حاملین عرش الٰہی ہوں گے (32:75)۔

حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمہ پر فوائد میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم نے تحریر فرمایا ''اس دنیا کا سارا نظام ہی ایسا رکھا گیا ہے کہ بندوں کو خیر و شر کے اکتساب میں مجبور محض نہ بنایا جائے۔ اگر صرف خیر کے اختیار پر سب کو مجبور کر دیا جاتا تو تخلیق عالم کی حکمت و مصلحت پوری نہ ہوتی اور حق تعالیٰ کی بہت سی صفات ایسی رہ جاتیں کہ ان کے ظہور کے لیے کوئی محل نہ ملتا مثلاً عفو، غفور، حلیم، منتقم، الشدید، قائم بالقسط، مالک یوم الدین وغیرہ حالانکہ عالم کے پیدا کرنے سے غرض ہی یہ ہے کہ اس کی تمام صفات کا مظاہرہ ہو۔ کوئی مذہب یا کوئی انسان جو خدا کو فاعل مختار مانتا ہے انجام کار اس کے سوا کوئی دوسری غرض نہیں بتا سکتا۔ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ (67:2) مولانا نے یہ بڑی درست بات تحریر فرمائی ہے۔

صفاتِ خداوندی کو عملاً ظہور میں لانے کے لیے اسلامی نظام کا قائم کرنا ہر شخص پر فرض ہے اور اسی سے اس کی پیدائش کا جواز پیدا ہوتا ہے اور اسی طرح ہر انسان صفاتِ خداوندی کو جگہ بہ جگہ موقع بہ موقع ظہور میں لا کر، اس کائنات کو آگے سے آگے لے جاتا ہے، اور اپنی زندگی کا مقصد پورا کرتا ہے۔ اس پورے عمل میں پرستش کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی بلکہ صفاتِ خداوندی پر اجتماعی طور پر عمل کرنے سے یہ کائنات اگلے مرحلہ میں داخل ہو جاتی ہے، جہاں زندگی مزید ترقی کرتی چلی جائے گی۔

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(گذشتہ سے پیوستہ)

دو قومی نظریۂ پاکستان والی
اِسلامی مملکت میں اِنسانی ذات کا ارتقاء

باب نمبر:3

حیوان کی احساسی جبلی زندگی سے عِلم و آزادیِ اِرادہ کی پیکرِ اِنسانی ذات میں ارتقاء

علم نفسیات کی رو سے اِنسانی جبلتوں پر مبنی اِنسان کی طبعی یا حیوانی حیات:

علم نفسیات کی جبلت (خواہش)، عادت اور ہیجان (احساسی پہلو) سے آگاہی کی بحث میں نفسیات کے ماہرین نے انسان کی طبعی یا حیوانی حیات کا نقشہ پیش کیا ہے۔ اِس میں علم نفسیات کی رو سے شخصیت کا تعین داخلی کیفیتوں سے ابتدا کرتا ہے۔ یہ طریقہ، انسان کو جبلتوں عادتوں اور احساسات کا نظام سمجھتا ہے جو انسان کو حوائج، محرکات اور خواہشات کے مربوط نظام میں باندھتا ہے اور ہمیں ماحول کے مطالعہ، استعمال اور تسخیر پر مجبور کرتا ہے۔ شخصیت کا یہ نقشہ انسان کی حیوانی زندگی بسر کرنے پر مشتمل ہے۔ جن میں کردار کو جبلی، لاشعوری اور غیر ارادی، میکانکی، انداز میں اپنایا جاتا ہے۔ اس نقشہ میں انسان کے عقلی پہلو پر نہیں، بلکہ احساسی پہلو کی وضاحت ملتی ہے جن میں کئی جبلتیں اشیاء یا تصورات کے گرد منظم شکل میں جمع ہو کر عواطف کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ جیسا کہ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں کہ جبلتِ، عاطفہ عشق میں کئی جبلتیں کارفرما ہیں، جن میں مادری پدری تحریک، ہوس، جنسی آرزو، بزم آرائی محبوب کی شخصیت سے منظم طریقے پر وابستگی شامل ہوگی۔

اِس ضِمن میں بنیادی طور پر نباتات کی ضروریات کے لیے احتیاج کا لفظ استعمال ہوتا ہے، جانوروں کے لیے اشتہا کا اور انسانوں کے لیے خواہش اور جذبات کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ نباتات میں صرف احتیاجات ہوتی ہیں۔ اُنہیں رجحان اور غایت دونوں کا شعور نہیں ہوتا۔ جانوروں میں احتیاجات اور اشتہا، دونوں موجود ہوتے ہیں اور رجحان کا شعور کا احساس بھی کسی قدر ہوتا ہے لیکن انہیں غایت کا علم نہیں ہوتا۔ انسانوں میں احتیاجات، اشتہا اور خواہشات تینوں ہی موجود ہوتی ہیں اور انسانی خواہش میں رجحان اور غایت دونوں کے متعلق شعور ہوتا ہے۔ وہ خواہشات پوری کرنے کے ذرائع کے حوالہ سے جائز اور درست کی تمیز بھی رکھتا ہے۔ اس بنا پر پروفیسر میکینزی انسانی خواہش اور حیوانی اشتہا کے ذریعے انسان کے اندر انسانی اور

حیوانی تقاضوں میں مندرجہ ذیل فرق بیان کرتا ہے۔

1۔اشتہا میں غایت کا شعور نہیں ہوتا، جذبات یا خواہش میں غایتی شعور کا ہونا ضروری ہے۔اس غایت کو حصولِ خیر کا ضروری ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔

2۔اشتہا جبلی اور فطری میلانات کا نام ہے، جذبات یا خواہش عقلی اور اکتسابی شے ہوتی ہے۔

3۔اگر خواہش پایہ تکمیل کو پہنچ جائے تو لذت کا موجب بنتی ہے اور اگر پوری نہ ہو سکے تو وہ الم کا باعث، لیکن خواہش میں انسان کے لیے لذت والم اتنی اہم نہیں جتنی جانوروں کی اشتہا میں ہے۔علم نفسیات کا موقف ہے کہ یہ عقل وخرد سے کام نہ کرنے والی اشتہا کے تحت طبیعی حیوانی زندگی جبر کے تحت گزاری جاتی ہے، جسے علم کے میدان میں تین گوشوں سے ظاہر کیا جاتا ہے۔

جبر کے تحت طبیعی/حیوانی زندگی گزارنے کے تین موقف ہیں۔

1۔طبعی یا حیوانی زندگی کا علم الحیات کا موقف

2۔طبعی یا حیوانی زندگی کا علم الانسان کا موقف

3۔طبعی یا حیوانی زندگی کا علم النفسیات کا موقف

1۔علم الحیات کی رو سے انسانی عادات وخصائل کے نقوش بچے کو نفسیاتی طور پر نہیں ملتے بلکہ جس طرح ایک بچہ مادہِ تولید کی وساطت سے اپنی رنگت وخدوخال، ماں باپ سے وراثت میں لیتا ہے اسی طرح اسے مادی طور پر ایسے اجزاء وراثت میں ملتے ہیں جنہیں جینز کہا جاتا ہے اور جن سے اس کا مزاج ترتیب پاتا ہے۔

اس نظریہ میں اب ذرا سی تبدیلی کی گئی ہے جس کی رو سے کہا جاتا ہے کہ یہ اجزاء تولیدی درحقیقت خام مسالہ ہوتے ہیں۔اس سلسلہ پر ماحول کا بھی اثر ہوتا ہے۔یعنی بچہ کا مزاج مرکب ہوتا ہے وراثتی مسالہ اور ماحول کے اثرات کا سب کچھ میکانکی طور پر ہوتا ہے۔

اس بارے میں ایک مکتبِ فکر کا خیال ہے کہ وراثت کے نقوش انمٹ ہوتے ہیں، جبکہ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ نہیں۔ان نقوش کو ماحول کی تبدیلی سے بدلا جاسکتا ہے۔یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ماحول اور وراثت کے نقوش اور خصوصیات میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔انسان کی ہر ایک عادت اور خصوصیت مرتب کرنے میں وراثت اور ماحول دونوں کا حصہ ہوتا ہے۔

2۔علم الانسان کی رو سے انسانی بچے کے ذہنی نقوش، معتقدات اور تصورات انفرادی چیز نہیں ہیں بلکہ وہ نسلی ہوتے ہیں۔ہر فرد کسی نہ کسی نسل سے تعلق رکھتا ہے جس کی ابتداء قبائل سے ہوتی ہے۔نسلی معتقدات اور تصورات وراثت کے ذریعہ سے ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتے رہتے ہیں اور اِنہی کے مجموعی تاثرات کا نام ایک فرد کے ذاتی خصائص اور رجحانات ہوتے ہیں۔

3۔علم نفسیات میں نظریہ کرداریت کا بھی اپنا ایک موقف ہے جس کا امام ڈاکٹر واٹسن ہے۔اُس نے اپنی تحقیقات کے

بعد اس نتیجہ کا اعلان کیا کہ جسے ہم نفسِ انسانی کا فیصلہ کہتے ہیں، وہ درحقیقت آزاد فیصلہ نہیں ہوتا بلکہ وہ مجموعی نتیجہ ہوتا ہے، ان تمام محرکات کا جو بچے کے (نفس) ذہن پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ اِنہی محرکات سے نفسِ انسانی کی عادات اور خصائل مرتب ہوتے ہیں اور یہ عادات وخصائل نسلاً بعد نسل بطور وراثت منتقل ہوتے ہوئے غیر شعوری طور پر مسلمات یا معتقدات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ بنا بریں جس چیز کو نفسِ انسانی کا فیصلہ کہا جاتا ہے وہ درحقیقت فیصلہ نہیں ہوتا بلکہ ان ہی محرکات کا طبیعی نتیجہ ہوتا ہے۔

جب بھی جبلی میلانات اپنی جبلتوں سے متاثر اور مشتعل ہو کر زیادہ فعال ہونے کے مُرتکب ہوتے ہیں، تو اُن کے احساسات کی تبدیلی کو نفسیات میں ہیجان کا نام دیا جاتا ہے۔ لہٰذا یہاں ہیجان کا علمِ نفسیات کی رو سے مُختصر جائزہ پیش جاتا ہے

جبلتوں سے مشتعل اِنسان کی ہیجانی زندگی میں کیفیت:

جدید حکمائے نفسیات ہیجان کو جبلت کا احساسی (Feelings) پہلو کہتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ہیجان جبلت ہی کے مشتعل ہونے پر معرض وجود میں آتا ہے۔ چنانچہ ہر ہیجان کی بنیاد جبلی ہوتی ہے۔ اس لیے انھوں نے ہر جبلت کے بالمقابل مشتعل ہونے پر ہیجان کو درج ذیل بدلتی حالتوں سے واضح کیا ہے۔

1۔ جبلت فرار سے مشتعل حالتِ ہیجان خوف میں تبدیل ہوجاتی ہے۔
2۔ جبلتِ تنفر سے مشتعل حالتِ ہیجان کراہت میں تبدیل ہوجاتی ہے۔
3۔ جبلت تجسس سے مشتعل حالتِ ہیجان حیرت میں تبدیل ہوجاتی ہے۔
4۔ جبلت نزاع پسندی سے مشتعل حالتِ ہیجان غُصہ میں تبدیل ہوجاتی ہے۔
5۔ جبلت خود ادعائی اور تحقیرِ نفسی سے مشتعل حالتِ ہیجان احساسِ برتری میں تبدیل ہوجاتی ہے۔
6۔ والدینی جبلتِ ترحم سے مشتعل حالتِ ہیجان احساسِ کمتری میں تبدیل ہوجاتی ہے۔
7۔ جبلتِ جنس سے مشتعل حالتِ ہیجان شہوت میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

اِن تبدیلیوں کی حالت سے واضح ہوتا ہے کہ جبلت ذہن کا ایک مستقل رجحان ہے مگر ہیجان ایک عارضی کیفیت ہے۔ اس سے مراد عضوے کی ایسی برانگیختہ کیفیت ہوتی ہے، جس میں خود اختیاری نظام عصبی (غدود، عضلات) درجہ اعتدال سے زیادہ فعال ہوتے اور مخصوص قسم کے جسمانی مظاہر مثلاً خون کے دباؤ، حرکت قلب اور تنفس میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ اس سے مراد احساسات کا فوری شدید اُبال ہوتا ہے جو محرک کا کام کرتا ہے۔

احساس کی جبلت سے مشتعل ایسی ہیجانی کیفیت کی زندگی کے لئے قرآنی اصطلاح الھوٰی کے ذریعہ سے وضاحت کی گئی ہے۔ امام راغب نے الھوی کے معانی اوپر سے نیچے گرنے کے کئے ہیں۔ اس کے معانی پست حیوانی خواہشات اور یہ انسان کو اس کے شرف ومنزلت سے گرا کر مصائب میں مبتلا کر دیتی ہیں۔

قرآن سے بھی ہمیں اس حیوانی ہیجان کی زندگی کی کچھ تفصیل اھواء کی شکل میں ملتی ہے۔ جو اس کے جِبلت سے مشتعل بلا لگام لاشعوری ہیجانی کیفیات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ قرآن کریم میں اس کی وضاحت ہے کہ انسانی خواہشات اگر وحی کے تابع نہ ہوں، تو ایسے احساسی پہلو سے مشتعل ہیجانی / اھوائی کیفیات کا حقیقت تک رسائی حاصل کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔

وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ (6:119)

''ایسے لوگوں میں سے بیشتر وہ ہیں، جنہیں اپنے ذاتی ہیجانی روش پر چلنے کی بِنا پر علم (وحی) کی سند حاصل نہیں ہوتی اور وہ لوگوں کو صحیح راستے سے بہکا دیتے ہیں۔''

جو لوگ اپنے جِبلی جذبات پر اپنی عقلِ فعال سے قابو نہیں کر پاتے، ایسی حالت میں قرآن میں اُن کی کیفیت یوں بیان کی جاتی ہے کہ

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ (7:176)

اگر وہ ہماری مشیت کے مطابق چلتا، تو ہم اسے بلندیوں کی طرف لے جاتے، لیکن ذاتی ہیجانات پر مبنی علم کے تحت وہ اپنی معاشی مفاد پرستیوں (ارض) کے ساتھ چمٹا رہا۔

قرآن یہاں وضاحت کرتا ہے کہ اللہ کی خواہش کے برعکس، ان میں سے اکثر افراد اپنی سرکش خواہشات کی اتباع کر کے زمین کی پستیوں کے ساتھ جا چپکتے ہیں۔ لہٰذا قرآن مومنین کو ہدایت کرتا ہے کہ جب تمہارے پاس وحی کی روشنی میں واضح راستہ سامنے آ گیا ہے تو ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کریں جو علم نہیں رکھتے۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ (28:50)

''اور اس سے زیادہ گمراہ کون جو اللہ کی ہدایت کے برعکس اپنی ہیجانی خواہش پر چلے''

قرآن ان کے درجات بلند کرتا ہے، جو خدا کی طرف سے علم و برہان کے مطابق چلے، ان کے مقابلے میں جو اپنی خواہشات کا اتباع کرے۔

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ (47:14)

''کیا وہ شخص برابر ہو سکتا ہے، جو خدا کی عطا کردہ بصیرت کی روشنی میں سیدھے راستے کی طرف جا رہا ہو، اس کے مقابلہ میں جو بُرے اور بھلے کی تمیز کھو کر اپنے ہیجانی جذبات کا اتباع کرے۔''

یہاں قرآن الانسان کی خاص اس حالت کا نقشہ کھینچ رہا ہے۔ جب وہ حیوانوں کی مانند اپنی جبلتوں کے احساس سے مشتعل ہو کر ہیجانی زندگی گزارتا ہے، جس میں نہ تو وہ عقل سے کام لیتا ہے اور نہ ہی اپنی آزادیِ اِرادہ سے اپنے جِبلی احساسات پر قابو پا رہا ہوتا ہے۔

قرآن میں ہیجانی کیفیت میں عقل سے کام نہ لینے والے مخصوص اِنسان کی حالت کا نقشہ:

ہمیں قرآن سے رہنمائی ملتی ہے کہ انسان حیوان سے بتدریج ترقی کرتا ہوا، انسانی پیکر میں آیا ہے۔ جب انسان کا شعور خام تھا تو وہ اپنی جبلتوں سے مشتعل ہیجانات پر قابو پانے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔ اِس کی وضاحت میں ارسطو کا قول ہے کہ انسانی بچپن کی زندگی اور حیوانی زندگی کی روح میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اِس لئے کہ بچپن کی حالت میں جب جبلت کے احساسی پہلو پر مشتعل ہو کر ہیجان کے تابع چلے تو ایسے میں الانسان کی حالت جانوروں جیسی ہو جاتی ہے۔ قرآن نے عقل سے قابو نہ پانے کی وجہ سے اِنسانی زندگی کے ہیجانی صِفات میں مبتلا ہونے کی حالت کی یوں تصویر کشی کی ہے کہ

اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۝ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ۝ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۝ (100:6-8)

''انسان، ربوبیت خداوندی کا ناشکر گزار ہے۔ مال و دولت کی محبت اس پر غالب رہتی ہے۔ وہ سب کچھ اپنے ہی لیے سمیٹ لینا چاہتا ہے۔''

جو لوگ علم الحق کی رہنمائی کے بغیر زندگی بسر کرتے ہیں، ایسے الانسان کو اپنی حالت پر بے باک چھوڑ دیا جائے، تو یہ سب کچھ اپنے لئے سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآن میں جہاں بھی الانسان کا لفظ آئے گا تو اس کے معانی ہیں ''وہ خاص انسان یا قوم، جو حیوانی سطح پر زندگی بسر کر رہی ہوتی ہے۔ یہاں اِس آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ اگر انسان کے سامنے وحی کی روشنی نہ ہو تو وہ ''کَنُوْدٌ'' بن جاتا ہے۔ اِس لفظ کے معانی ہیں وہ جو سب کچھ اکیلا ہی کھا جائے اور دوسروں کو کچھ نہ دے۔ ایسی حیوانی زندگی گزارنے والے کی قرآن نے وضاحت کی ہے کہ

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝ (103:1-2)

زمانہ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ الحق کی راہنمائی کے بغیر زندگی بسر کرنے والے انسان، بلاشبہ ہمیشہ خسارے اور نقصان ہی میں رہے ہیں۔

الْعَصْرِ سے مراد ہے پوری نوع انسانی کی تاریخ ہے۔ عرب کہتے ہیں کہ ہر موجودہ دور کی تاریخ، اپنے ماضی کا نچوڑ ہوتا ہے۔ سارے قرآن میں سابقہ اقوام نوحؑ، عاد و ثمود، مدین، لوطؑ، بنی اسرائیل، فرعون وغیرہ کی تفاصیل پھیلی ہوئی ہیں۔ اس آیت میں لفظ الْعَصْرِ سے سابقہ تباہ ہونے والی اقوام کی طرف اشارہ کر کے، ان کو شہادت میں پیش کیا ہے کہ دیکھ لو، جن اقوام نے ہمارے قوانین کے مطابق زندگی بسر نہیں کی تھی، تو وہ کیسے خسارے میں رہیں، تباہ و برباد ہوئیں۔ لہٰذا آئندہ بھی، جو اقوام ہمارے قوانین کے مطابق زندگی بسر نہیں کریں گی، ان کا بھی وہی حشر ہوگا، جو گزشتہ اقوام کا ہو چکا ہے۔ قرآن میں اِس خسارے کی زندگی میں الانسان میں درج ذیل صِفات کی خلقت کی نشاندہی کی گئی ہے کہ وہ

1۔ خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ؕ (21:37)

''انسان کو جلد باز پیدا کیا۔''

عجل سے ہی ہمارے ہاں عجلت کا لفظ ہے۔ ایک اور مقام پہ ہے۔

2۔ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ (30:54)

''تمہیں کمزور پیدا کیا''۔

مِنْ عَجَلٍ اور مِّنْ ضُعْفٍ کے یہ معانی نہیں کہ تمہیں جلد بازی اور کمزوری سے پیدا کیا ہے۔ ''مِنْ'' کہہ کر خدا نے انسان کی حیوانی جلد باز اور کمزور ہونے کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ حیوانی سطح پر انسان کی زندگی، وہی جبلّتیں اپنے اندر رکھتی ہے، جو عام طور پر حیوانات کی ہوتی ہیں۔ حیوانات میں ''زندگی کا تحفظ'' Self Preservation ایک بنیادی جبلّی تقاضا ہوتا ہے۔ اس تقاضے کی رو سے، اس کی طبعی زندگی کا تحفّظ اور سامان زیست وابستہ ہوتا ہے۔ اِسے نہ چھوڑنے کی چاہت میں وہ آخرت اور اِنسانی ذات پر ایمان نہیں رکھتا۔ اِس بنا پر وہ اپنی طبعی زندگی کے جِبلی تقاضوں پورا کرنے میں مصروف رہتے ہوئے اپنی پوری زندگی بسر کر دیتا ہے۔ قرآن وضاحت کرتا ہے کہ اِس روش پر چلنے سے اُس کی زندگی میں درجِ ذیل صِفات پیدا ہوتی ہیں۔

3۔ وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ ؕ (17:11)

انسان بھلائی کی بجائے ان چیزوں کو آواز دے کر بلاتا ہے جو اس کے لیے برائی کا موجب ہوں۔

قرآن نے یہاں یہ بھی وضاحت کی ہے، کہ اِنسان جسے اپنے لئے شر سمجھتا ہے، ہوسکتا ہے کہ وہ اس کے لئے خیر ہے۔ لہٰذا ایسا الانسان اپنی الکنود حالت میں اپنے لئے خیر و شر میں امتیاز کرنے میں بھی ناکام رہتا ہے۔ قرآن میں ہے کہ:

لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ؕ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ (24:11)

تُم اُسے اپنے لئے شر نہ سمجھو، بلکہ یہ تمہارے لئے خیر ہے۔

یہاں مزید تین صِفات کا ذکر کر کے مزید الانسان کی حالتِ کنود کی وضاحت کر دی کہ:

4۔ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا (17:67)

''انسان بڑا ناشکر گزار ہے''۔

5۔ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا (17:100)

''انسان بڑا تنگدل واقع ہوا ہے''۔

6۔ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (33:72)

''یہ بڑا ظالم اور جاہل ہے''۔

یہ سب اِس لئے ہوتا ہے کہ

7۔وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (47:12)

''(الحق کا) کفر کرنے والے بس دنیا کی چند روزہ زندگی کے مزے لوٹ رہے ہیں۔اور جانوروں کی طرح کھا پی رہے ہیں''۔

قرآن کی سورہ المعارج میں ترتیب وار اسی الانسان کی چار مزید صِفات کا ذکر کیا گیا ہے۔

8۔وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۝ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۝ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۝ (70:18-21)

وہ مال کو تھیلی میں رکھ کر جمع کرتا ہے پیدائشی طور پر تنگ دل اور بے صبرا ہو جاتا ہے ذرا سی تکلیف پُہنچے تو واویلا مچانا شروع کر دیتا ہے۔جب مال ہاتھ آ جائے تو کسی ضرورت مند کو نہیں دیتا۔

اِن کے علاوہ سورہ الدھر میں مزید صِفات کا ذکر ہے کہ

9۔اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا (76:27)

''انسان پیش پا افتادہ مفاد کے پیچھے لپکتا ہے۔(عاقبت اندیشی سے کام نہیں لیتا) اور آگے جو بھاری دن آنے والا ہے اسے نظر انداز کر دیتے ہیں''۔

الغرض کہ وہ

10۔اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ (98:6)

(انسان کو بہترین ہیت میں پیدا کیا) لیکن یہ لوگ تمام مخلوق سے بدتر ہیں۔

اِسی لئے وہ

11۔وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا (18:54)

''بے شک انسان اکثر جھگڑے نکالتا رہتا ہے''۔

12۔كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۝ (96:6)

''یہ انسان بڑا ہی سرکش واقع ہوا ہے''۔

اِن سب کی بنیادی وجہ یہی سامنے آتی ہے کہ یہاں الانسان اپنی ذات کا ہی کا مُنکر ہوتا ہے اور اِسی لئے قرآن اُسے حیوان، بلکہ حیوان سے بھی بدتر زندگی گزارنے والا کے مقام پر رکھ رہا ہوتا ہے۔آگے ہم دیکھیں گے کہ اِس جبلی، لاشعوری اور غیر ارادی میکانکی انداز حیوانیت کی روش سے ہٹ کر ماہرِ نفسیات جبلی، شعوری، ارادی اور انسانی اعمال کی بات کرتے ہیں۔تو اسے اِنسان کے عقلی پہلو جذبات کے دائرے کی شکل میں سامنے لاتے ہیں۔اِسے قدرے تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔

علمُ نفسیات کی رو سے انسانی عقل کا جبلتوں پر قابو پا کر جذبات کے مقام تک پہنچنا:

جذبات کی اصطلاح سے ان تاثرات و ہیجانات کی تنظیم کا مفہوم لیا جاتا ہے جو کسی شے یا تصور سے وابستہ ہوتی ہے۔

بعض لوگ جذبے کی اس عقلی تنظیم کے اس قدر قائل ہیں کہ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ جذبہ جس سے متعلق ہوتا ہے۔ وہ شے ہمیشہ ایک فکری یا تصوری ہوتی ہے نہ کہ مادی۔ جذبہ کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ یہ کسی مخصوص شے کے متعلق ذہن کی ایک مرکب اور کم وبیش مستقل حالت ہے، جس میں انسان اس شے سے متعلق کسی مخصوص ہیجان کی طرف میلان رکھتا ہے۔

جبلتیں حیوان اور جذبات اِنسان کی خاصیت ہیں اور انسان کی حیوان سے تمیز کرنے کے لیے جذبات کو سپائی نوزا منفعل اور فعال میں تقسیم کرکے، انسانی رویہ کی وضاحت کرتا ہے۔

1۔ منفعل جذبات وہ ہیں جن کی علتوں کا ہم فہم نہیں رکھتے، بلکہ ہم پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ اس کی علت جزوی طور پر ہمارے خارج سے ہوتی ہے۔ اِنسانی شخصیت کی تعمیر کے لئے یہ غیر معتدل اور ناموزوں شمار ہوتے ہیں۔

2۔ فعال جذبات جو منفعل جذبات کے برعکس ہمارے اپنے علم اور شعور سے حاصل ہوتے ہیں اور یہ انسان کو حیوانوں سے ممتاز کر دیتے ہیں۔ فعال جذبات کو سپائی نوزا مزید دو بڑی مدّات میں تقسیم کرتا ہے۔

(الف) ایک عقلی حُبِ نفسی، جو شہوت یا اشتہائے نفس سے تعلق رکھتی ہے، یہ صرف ہماری خواہشات کے تحفظ کا احساس رکھتی ہے اور اس کا دوسروں کے لئے ایثار

(ب) دوسری عقل فیض رسانی جو سخاوت کہلاتی ہے اور انسانوں کو غلامی سے نکال کر آزادی عطا کرتی ہے۔

جذبات کا مُعرضِ وجود تب ہوتا ہے جب حیوان کی جبلتوں پر اِنسانی عقل سے قابو پا کر ان کو اِنسانی جذبات میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ اِس لئے کہ اِنسانی ذہن سے کوئی جذبہ ہی دوسرے جذبے کو نکال سکتا ہے۔ چنانچہ منفعل جذبات کو شکست دینے اور مار بھگانے کے لیے اِنسان کے اپنے فعال جذبات ہی کارآمد ہو سکتے ہیں۔ اِسی کے تسلسل میں فعال جذبات میں حُبِ نفسی کو عقلِ فیض رسانی میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ اِسی لئے افراد اور معاشروں کی سیرت اور کردار کے سلسلے میں جذبات کی نشوونما بہت اہمیت رکھتی ہے۔

علمِ نفسیات میں میکڈوگل نے جذبات درج ذیل تعریف کی ہے، جسے بہت اہمیت حاصل ہے۔

''جذبات اساسی اور کرداری زندگی کی تنظیم کا باعث قرار پاتے ہیں۔ جذبات کے بغیر ہماری ہیجانی زندگی افراتفری کی زندگی ہوگی۔ یعنی ہماری زندگی تنظیم توافق اور تسلسل کے بغیر ہوگی اور ہمارے تمام معاشرتی روابط اور کردار ہیجانات اور ان کی انگیختوں پر مبنی ہونے کی وجہ سے درہم برہم، ناقابل پیشین گوئی اور غیر متوازن ہوں گے۔ جذبات میں ہیجانی میلانات کی باقاعدہ تنظیم ہی کی وجہ سے ہیجانات کی فوری اشتعال انگیزیوں کا ارادی انضباط ممکن ہوتا ہے۔ علاوہ بریں خوبیوں اور قدروں سے متعلق ہمارے فیصلوں کی بنیاد ہمارے جذبات ہی ہوتے ہیں۔ اور وہی ہمارے اخلاقی اصولوں کے سرچشمے ہوتے ہیں کیونکہ ہمارے ان فیصلوں سے تشکیل پذیر ہوتے ہیں جن کا تعلق اخلاقی قدروں سے ہوتا ہے۔

میکڈوگل کے اِس قدرے طویل تصورِ جذبات کے تجزیہ سے درجِ ذیل صلاحیتوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔

1۔افراداور معاشروں کی سیرت اور کردار کے سلسلے میں جذبات کی نشوونما بہت اہمیت رکھتی ہے۔

2۔جذبات اساسی اور کرداری زندگی کی تنظیم کا باعث ہوتے ہیں۔

3۔جذبات کے بغیر ہماری ہیجانی زندگی افراتفری کی زندگی ہوگی۔یعنی تنظیم،توافق،اور تسلسل کے بغیر ہوگی۔

4۔ ہمارے تمام معاشرتی روابط اور کردار ہیجانات اور ان کی انگیختوں پر مبنی ہونے کی وجہ سے درہم برہم، ناقابل پیشین گوئی اور غیر متوازن ہوں گے۔

5۔جذبات میں ہیجانی میلانات کی باقاعدہ تنظیم ہی کی وجہ سے ہیجانات کی فوری اشتعال انگیزیوں کا ارادی انضباط ممکن ہوتا ہے۔

6۔خوبیوں اور قدروں سے متعلق ہمارے فیصلوں کی بنیاد ہمارے جذبات ہی ہوتے ہیں۔

7۔اور وہی ہمارے اخلاقی اصولوں کے سرچشمے ہوتے ہیں کیونکہ ہمارے ان فیصلوں سے تشکیل پذیر ہوتے ہیں جن کا تعلق اخلاقی قدروں سے ہوتا ہے۔''

عِلمِ نفسیات میں جذبات کی اہمیت یوں سامنے آتی ہے کہ ہمارے فیصلوں کی بنیاد ہمارے جذبات ہی ہوتے ہیں جس طرح انسان میں عقل وشعور،فہم وادراک اور قوت کی مختلف صلاحتیں ہیں۔اسی طرح جذبات بھی صلاحیت کے مظہر ہوتے ہیں اور یہ صلاحیت بڑی اہم ہوتی ہے اس لیے کہ انسانی عمل (کام) کے محرک اس کے جذبات ہی ہوتے ہیں۔البتہ عصر حاضر کے ماہرینِ نفسیات کہتے ہیں کہ نفس بطورِ وحدت کام کرتا ہے۔اصل میں اعمال کے اسباب خلقی واکتسابی رُجحانات ہیں اور عقل کا کام ان کی راہنمائی ہے۔اصلی محرک عالم جذبات ہے جو ارادوں کو بناتی اور بگاڑتی ہے اور یہی صدورِ افعال کا باعث بھی ہے۔

علم نفسیات میں حیوان سے انسان کی ارتقائی منزل میں پہلے قدم رکھنے کو جبلت سے مُشتعل ہیجانی روش پر انسانی عقل سے جذبات کے تحت قابو میں رکھنے سے مشروط کیا گیا ہے۔اگر ایسا نہ کیا جائے تو اِنسان حیوان کے درجہ میں ہی رہتا ہے۔

یہاں حیوان اور انسان میں فرق ظاہر ہوجاتا ہے کہ حیوان میں جبلت خود ہی عقل کا فریضہ انجام دیتی ہے، جبکہ انسانی عقل جِبلت پر قابو پاکر ان میں سے انتخاب کرنے پر قادر ہوجاتی ہے۔جب انسان عقل بالقوت یعنی جبلتوں، ہیجانات اور عادتوں کو، عقل کے ذریعے جذبات کی شکل میں انتخاب کرتا ہے تو اسی عقل فعال کی بدولت اس کا حیوان سے انسان کی سمت ارتقاء شروع ہوجاتا ہے۔اس کے برعکس اگر وہ عقل فعال (جو اسے حیوان سے علیحدہ کرتی ہے) سے کام نہیں لیتا تو وہ منطق کی رو سے حیوان کے درجے میں ہی رہتا ہے اور اس طرح وہ اپنے ارتقاء سے محروم رہتا ہے۔اِسی طرح اگر وہ عقلی حُبِ نفسی کی اِنسان کی طبعی زندگی پر عقلِ فیض رسانی کو ترجیح دے کر مزید ارتقاء سے اِنسانی ذات کا حامل بن جاتا ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین نے اِنسان کا جِبلت کی حیوانی زندگی سے ارتقاء کرتے ہوئے اپنی عقل سے اُن پر قابو پاکر جذباتِ فیض رسانی سے اِنسانی ذات کی زندگی اختیار کرنے کا موازنہ یوں کیا ہے کہ جبلت کی وضاحت میں دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنی

صِفات کی بدولت اِنسان کو حیوانی زندگی سے بلند درجہ میں پہنچنے نہیں دیتی ہے۔ وہ اِس کی وجوہات یوں گنواتا ہے کہ:

1۔ ایک حیوان کے سارے افعال جبلتوں کے ماتحت وقتی تکمیل کے لیے سرزد ہوتے ہیں۔

2۔ جبلت عمل کرنے کا ایک خاص اندرونی حیاتیاتی دباؤ ہے جس کے لیے حیوان کے نظام عصبی یا دماغ میں خاص مراکز موجود ہوتے ہیں۔ ایک حیوان اسی صورت میں غذا کی تلاش پر آمادہ ہوتا ہے جب اسے بھوک کی تڑپ محسوس ہو۔ جوں ہی اس کا پیٹ بھر جاتا ہے وہ فکرِ فردا سے مستغنی ہو کر بیٹھ رہتا ہے اور پھر اس وقت چونکتا اور روبہ عمل ہوتا ہے جب اس کا نظام عصبی دوبارہ غذا کی طلب محسوس کرے۔

3۔ یہ جبلت کی قدرتی فعلیت، ایک خاص اندرونی یا بیرونی تحریک (Stimalus) کے ماتحت ایک خاص مدعا کے ساتھ اور ایک خاص قسم کی جذباتی کیفیت یا عاطفہ و ہیجان (Emotion) کی ہمراہی میں شروع ہوتی ہے اور جب تک مدعا حاصل نہیں ہو جاتا برابر جاری رہتی ہے۔

4۔ جبلتوں کے عمل کی قدرتی غرض یہ ہے کہ فرد کی حیوانی زندگی اور نسل باقی رہے۔

5۔ انسان کے اندر وہی جبلتیں ہوتی ہیں ہیں جو اس سے نچلے درجہ کے حیوانات میں موجود ہوتی ہیں کیونکہ جہاں تک بقائے حیات اور نسل کا تعلق ہے تو اِس حوالہ سے انسان کی ضروریات بالکل وہی ہیں جو حیوان کی ضروریات ہیں۔

اِنسانی ذات کی خصوصیت ہے کہ وہ عقلِ فعال سے حیوانی جِبلتوں پر قابو پاتے ہوئے جذبات کے ذریعہ درجِ ذیل وجوہات کی بنا پر اِنسانی ذات کا مقام حاصل کر سکتا ہے۔

1۔ اِنسانی مقام میں عقل کی بدولت ہم میں خواہش کے مقصود کا شعور پیدا ہوتا ہے۔

2۔ ہم اپنی خواہشات کو مربوط کر کے ان میں ایک نظام پیدا کرتے ہیں۔ پھر وہ جدا جدا مظاہر کی حیثیت سے باقی نہیں رہتیں۔

3۔ ہم پورے نظام کی مجموعی طور پر تسکین و طمانیت تلاش کرتے ہیں جو انفرادی خواہشات، اور انا کی تسکین کا محض ایک پسندیدہ جزو بن جاتی ہے۔

اِنسان کو جذبات پر قابو پانے کی صلاحیت کو ثابت کرنے کے لئے غور و فِکر سے عقل کے استعمال سے عِلم حاصل کرنا لازمی ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں صرف ارتقاء یافتہ انسان ہی ایسی واحد مخلوق ہے جو عقل رکھتی ہے۔ اِسی لئے قدیم حکمائے مغرب انسان کی حیوان سے ارتقائی برتری ثابت کرنے کے لئے عاقل حیوان کی اصطلاح سے ثابت کرتے تھے کہ اِسے عِلم یا تعقل کی صلاحیت سے مالا مال کیا گیا ہے۔ لہٰذا ہمارے لئے یہاں تعقل کا نظریہ سمجھنا لازمی ہو جاتا ہے۔

نظریہِ تعقل کا تاریخ میں سب سے پہلے دنیا کے عظیم فلسفی سقراط کا ذکر ملتا ہے۔ اُس کے نظریہِ تعقل سے انسان کے موجودہ تصور کے موقف کا تجزیہ کرنے سے پہلے اُس کا پس منظر میں سوفسطائی کے نظریہ کو ذہن میں رکھنا ہوتا ہے۔

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت ادارہ طلوعِ اسلام، لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہوچکی ہے۔ یہ جلدیں 20X30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورۃ الفاتحہ	(1)	240	200/-
سورۃ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-
سورۃ البقرہ (اوّل)	(2)	500	400/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-
سورہ آل عمران (اوّل)	(3)	472	500/-
سورہ آل عمران (دوم)	(3)	480	500/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-
سورۃ المائدہ	(5)	450	500/-
سورۃ الانعام	(6)	600	600/-
سورۃ الاعراف (اوّل)	(7)	480	500/-
سورۃ الاعراف (دوم)	(7)	400	500/-
سورۃ الانفال	(8)	210	250/-
سورۂ توبہ	(9)	530	550/-
سورۂ یونس	(10)	360	400/-
سورۃ ھود	(11)	400	400/-
سورۃ یوسف	(12)	288	300/-
سورۂ رعد، ابراہیم، الحجر	(13-14-15)	500	500/-

سورۃ النحل	(16)	334	300/-
سورۃ بنی اسرائیل	(17)	396	400/-
سورۃ الکہف، سورۃ مریم	(18-19)	532	500/-
سورۃ طٰہٰ	(20)	416	350/-
سورۃ الانبیآء	(21)	336	300/-
سورۃ الحج	(22)	380	350/-
سورۃ المؤمنون	(23)	408	400/-
سورۃ النور	(24)	264	350/-
سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-
سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-
سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورۃ القصص	(28)	334	350/-
سورۃ العنکبوت	(29)	388	350/-
سورۃ روم، لقمان، السجدہ	(30-31-32)	444	400/-
سورۃ الاحزاب، سبا، فاطر	(33-34-35)	570	400/-
سورۃ یٰسٓ	(36)	164	150/-
سورۃ الصفٰت، ص، زمر	(37-38-39)	450	400/-
سورۃ مومن حٰمٓ سجدہ، سورہ شوریٰ	(40-41-42)	624	550/-
سورۃ زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45-46-47)	520	500/-
سورۃ الفتح، الحجرات، قٓ، الذاریات، الطور، النجم	(48-49--51-50-52-53)	550	500/-
سورۃ القمر، الرحمٰن، واقعہ، الحدید	(54-55-56-57)	384	400/-
28واں پارہ (مکمل) مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون، تغابن، طلاق، تحریم	-64-65-66) (58-59-60-61-62-63	300	300/-
29واں پارہ (مکمل)		544	400/-
30واں پارہ (مکمل)		624	400/-
شرح جاوید نامہ		800	1000/-
فہرست موضوعات مطالب القرآن فی دروس الفرقان		800	1000/-

The world is desperate for Prophet's (PBUH) revolutionary system

By G. A. Parwez
(Translated by: Mansoor Alam)

Creation, destiny, and guidance is beginning
Prophet's universal grace and mercy is the end

My dear friends, Salam-o-Rahmat!
How fortunate we are that we are honoring the Prophet (PBUH) whose life is a shining example and universal role model forraising the dignity and status of entire humankind. It will not be enough no matter how much we thank the Almighty for showering His Grace and Honor on humanity. And also it is very apt that we are honoring the Prophet (PBUH) at a time when the spring season has just started which imparts new lifeand beauty to nature:This celebration of Eid Mildun Nabi and the magnificence of spring season – what a beautiful coincidence!
As you know the title of this presentation is: "The world is desperate for Prophet's (PBUH) revolutionary system". To get to this topic, it is necessary to clarify as to what the duty of a messenger is. Sincethe Deen has been replaced by religion now, only sermonizing is being practiced by religious leaders. It is commonly understood that a messenger comes to teach people morals and ethics through his sermons. It is true that the Prophet (PBUH) also taught ethics and morals, but it was not the main goal. This was only a means to achieve a higher goal and that was to create revolution in human society to reform its social, cultural, judicial, political, economic affairs. Allama Iqbal has explained this duty of the Prophet in detail in chapter 5 of his book "Reconstruction of Religious Thought in Islam" thus:
"Muhammad of Arabia ascended the highest Heaven and returned. I swear by God that if I had reached thatpoint, I should never have returned. These are the words of a great Muslim saint, 'AbdulQuddës ofGangoh. In the whole range of Sufi literature, it will be probably difficult to find words which, in a singlesentence, disclose such an acute perception of the psychological difference between the prophetic and themystic types of consciousness. The mystic does not wish to return from the repose of 'unitary experience';and even when he does return, as he must, his return does not mean much for mankind at large. Theprophet's return is creative. He returns to insert himself into the sweep of time with a view to control theforces of history, and thereby to create a fresh world of ideals. For the mystic the repose of 'unitaryexperience' is something final; for the prophet it is the awakening, within him, of world-

shakingpsychological forces, calculated to completely transform the human world. The desire to see his religiousexperience transformed into a living world-force is supreme in the prophet. Thus his return amounts to akind of pragmatic test of the value of his religious experience. In its creative act the prophet's will judgesboth itself and the world of concrete fact in which it endeavours to objectify itself. In penetrating theimpervious material before him the prophet discovers himself for himself, and unveils himself to the eye ofhistory. Another way of judging the value of a prophet's religious experience, therefore, would be toexamine the type of manhood that he has created, and the cultural world that has sprung out of the spirit ofhis message."

At this time, I don't want to go through the details of what the reality is of Sufism and what different stations the Sufis go through. I just want to point out that how important it is what Allama Iqbal has explained above the duty of a messenger; and how a messenger is quite different from other reformers, leaders, and preachers. We cannot appreciate how beautifully and effectively the Prophet (PBUH) fulfilled his mission unless we know what the condition of the world was when the Prophet (PBUH) started his divine mission. I do not want say this myself but I want to present evidence from a non-Muslim scholar. The famous scholar Dennison presents the picture of the world at the time when the Prophet (PBUH) appeared:

"It seemed then that the great civilization that it had taken four thousand years to construct was on the verge of disintegration, and that mankind was likely to return to that condition of barbarism where every tribe and sect was against the next, and law and order were unknown. The old tribal sanctions had lost their power. Hence the old imperial methods would no longer operate. The new sanctions created by Christianity were working division and destruction instead of unity and order. It was a time fraught with tragedy. Civilization, like a gigantic tree whose foliage hadoverarched the world and whose branches had borne the golden fruits of art and science and literature, stood tottering, its trunk no longer alive with the flowing sap of devotion and reverence, but rotted to the core, riven by the storms of war, and held together only by the cords of ancient customs and laws, that might snap at any moment. Was there any emotional culture that could be brought in, to gather mankind once more into unity and to save civilization? This culture must be something of a new type, for the old sanctions and ceremonials were dead, and to build up others of the same kind would be the work of centuries … It seems amazing that there should have arisen just at the time when it was most needed a culture of precisely the type outlined above." [Emotion as the basis of civilization by J.H. Denison, page 267-268]

Allama Iqbal has summed it up in his own beautiful style of what was the condition of humankind as a whole at that time:

Humans were worshipping humans; they were ignoble, non-existent, at the bottom
Pirates of humanity Caesars andChosroeshad chained their hands, feet, and neck

Sorcerers, priests, rulers, and their armies – one game (humanity); hundred hunters

Shah Waliullah said regarding this ignoble state of humanity:
Because at that time there was chaos in social, political, and economic systems, the goal of the Prophet (PBUH) was to reform these essential areas of human affairs. And with the Prophet's (PBUH) hands the Roman and Persians empires were destroyed which were the source of this turmoil and enemies of humanity. [Tafheemaat-e Ilaahiyah, Vol.1, page 66]

Universal Messengerhood

Although every messenger of Allah was a revolutionary, but there is basic difference between previous messengers and the last Messenger, the Prophet (PBUH). All the messengers that came before,they came to their isolated towns because there was no means of communications at that time. So, their reform efforts were limited to their local demographics.But the Prophet (PBUH) came at a time which creates a distinct boundary line between the old isolatedlocalized world and the new connected globalized world. Old demographics and population centers were merging together and the world was on the path to becomeone large global human society. Therefore, the Prophet (PBUH) was not only sent to a particular people at a particular time but his Prophethood was for all the world and for all the times. The Quran says: قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا(7:158) – O Messenger! Please proclaim to entire humankind that I am the Messenger of Allah to all of you collectively. And: وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا (34:28) – O Messenger We have sent you as Our Messenger to the whole of humankind, with the mission that you should tell people how pleasant the results of following the Divine Law would be; and how awful and destructive the results of opposing it would be.This applies for all times and for all of humanity. It was not just for the time of the Prophet (PBUH). It is mentioned in Surah Al-Juma'ah: وَآخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (62:3) – The message of the Messenger is not confined to this nation only. This message is also for those who will come after these people. In other words, the Messenger has been sent to humanity at large, the present as well as future generations. That is why the Quran has been preserved for all times to come. The Messenger's task of passing on the message would continue forever by his followers, through the Quran. That is why the Quran says about Allah, His Book, and His last Messenger: رَبِّ الْعَالَمِينَ(1:2) – The Almighty is Sustainer of the worlds. إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ(38:87) – This message is a guidance for the whole of humanity.وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ(21:107) – The code of Divine Laws according to which you become the rightful inheritors of this earth, has now been given to the people through you; so, "O Messenger! Proclaim to all people that their correct and complete development can only be achieved through obeying these Divine Laws. The nation that rejects these Laws will be deprived of Divine blessings (9:61). Your Messengerhood shall thus become a source of real blessings for all humanity.That is why Allah proclaimed His final eternal Book complete and

unchangeable:وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَ عَدْلًا ۚ لَّا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهٖ (6:115) – Allah's laws based on truth and justice have been set forth in this Book in a complete form. None has the authority to make any change in these laws (18:27). And this system will prevail over all systems: هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ(61:9) – It is Allah Who has sent His Messenger with a Code of Guidance and a system of life based on absolute truth. His aim is that it will ultimately triumph over all other systems in the world, no matter how detestable this may be to those who want to obey laws of others other than those given by Allah.

The Revolution created by the Prophet (PBUH)

This revolution was limitless. But it is obvious that it had to start from the place where the Prophet (PBUH) started his divine mission. What kind of extraordinary transformation happened to the Arabian society because of Prophet's (PBUH) led revolution let us find its evidence from non-Muslim scholar Pringle Kennedy who says:

"How in a few years all this was changed, how by 650 A.D. a great part of this world became a different world from what it had been before, is one of the most remarkable chapters in human history." [Arabian Society At The Time Of Muhammad,by Pringle Kennedy, page 18]

Thomas Carlyle, in his unique style, writes:

"To the Arab Nation it was as a birth from darkness into light; Arabia first became alive by means of it. A poor shepherd people, roaming unnoticed in its deserts since the creation of the world: a Hero-Prophet was sent down to them with a word they could believe: see, the unnoticed becomes world notable, the small has grown world-great; within one century afterwards, Arabia is at Grenada on this hand, at Delhi on that;—glancing in valour and splendour and the light of genius, Arabia shines through long ages over a great section of the world. Belief is great, life-giving. The history of a Nation becomes fruitful, soul elevating, great, so soon as it believes. These Arabs, the man Mahomet, and that one century,—is it not as if a spark had fallen, one spark, on a world of what seemed black unnoticeable sand; but lo, the sand proves explosive powder, blazes heaven-high from Delhi to Grenada! I said, the Great Man was always as lightning out of Heaven; the rest of men waited for him like fuel, and then they too would flame." [On Heroes,Hero-Worship,and the Heroicin History by Thomas Carlyle page 76]

The famous historian Gibbon says in this connection:

"The creed of Mahomet is free from suspicion or ambiguity; and the Koran is a glorious testimony to the unity of God. The prophet of Mecca rejected the worship of idols and men, of stars and planets, on the rational principle that whatever rises must set, that whatever is born must die, that whatever is corruptible must decay and perish. In the Author of the universe, his rational enthusiasm confessed and adored an infinite and eternal being, without form or place, without issue or similitude, present to our most secret thoughts, existing by the necessity of his own nature, and deriving

from himself all moral and intellectual perfection. These sublime truths, thus announced in the language of the prophet, are firmly held by his disciples, and defined with metaphysical precision by the interpreters of the Koran. A philosophic theist might subscribe the popular creed of the Mahometans; a creed too sublime, perhaps, for our present faculties.

"It is not the propagation, but the permanency, of his religion, that deserves our wonder: the same pure and perfect impression which he engraved at Mecca and Medina, is preserved, after the revolutions of twelve centuries, by the Indian, the African, and the Turkish proselytes of the Koran.The Mahometans have uniformly withstood the temptation of reducing the object of their faith and devotion to a level with the senses and imagination of man. "I believe in one God, and Mahomet the apostle of God," is the simple and invariable profession of Islam. The intellectual image of the Deity has never been degraded by any visible idol; the honors of the prophet have never transgressed the measure of human virtue; and his living precepts have restrained the gratitude of his disciples within the bounds of reason and religion. [Gibbon, The Decline and Fall of Roman Empire, page 287 and page 352]

And famous scholar Robert Briffault says:

"It is highly probable that but for the Arabs modern European civilization would never have arisen at all; it is absolutely certain that but for them, it would not have assumed that character which has enabled it to transcend all previous phases of evolution. For although there is not a single aspect of European growth in which the decisive influence of Islamic culture is not traceable, nowhere is it so clear and momentous as in the genesis of that power which constitutes the paramount distinctive force of the modern world and the supreme source of its victory natural science and the scientific spirit. … What we call science arose in Europe as a result of a new spirit of inquiry, of new methods of investigation, of the method of experiment, observation, measurement, of the development of mathematics in a form unknown to the Greeks. What we call science arose in Europe as a result of a new spirit of inquiry, of new methods of investigation, of the method of experiment, observation, measurement, of the development of mathematics in a form unknown to the Greeks. That spirit and those methods were introduced into the European world by the Arabs. [Robert Briffault, The Making of Humanity, page 191]

"It is in the first three centuries of the present millennium that the rebirth of Europe took place. The term 'Renaissance' applied to the Italian and Italianate culture of the fifteenth and sixteenth centuries is a misnomer stamped upon our notions by the traditions of that culture itself. The gaudier splendour of European life at that epoch was the outspreading of overblown blossoms whose buds the previous centuries had called to life and unfolded. To that antecedent impulse it owed its worth. The invention of printing, to a far greater extent than the study of ancient literature, strengthened and accelerated the process…. The paramount part played by Arab culture in the awakening of Europe, on which I have dwelt at some length

proportionate to the grossness and insistence of current misrepresentation it would be difficult to exaggerate. But there is no need to magnify the intrinsic worth and quality of that culture. Admirable as was that quality, and supremely momentous as its action and influence proved." [Robert Briffault, The Making of Humanity, page 222]

The Prophet's (PBUH) revolutionary divine system

I think that this provides enoughevidenceofhow theQuranic universal welfare system (Deen) established by the Prophet (PBUH)served as a catalyst for positive transformation of the world, which it is now desperate to adopt.

The Prophet (PBUH) laid the foundation and built the infrastructure of this divine system and the rightly-guided Khalifas advanced and expanded it. But, after them, the Mulukiyyah took over and changed the direction of Islamic train from the track of Deen and put it on their man-made religious track. So, Deen was changed into religion. And the Prophet's (PBUH) revolutionary program no longer remained. Custodians of religion under the service of kings and capitalists changed the Prophet's (PBUH) program of collective Deen into personal salvation based on mechanical religious rituals. I have clarified it again and again that the divine laws, on whose foundation the human life-system is built,are eternal and unchangeable and always active just as the divine laws of nature.The only difference is that when a group of humans stands up and decides with utmost unwavering fortitude to implement the divine system of life then the time-frame of these laws is speeded upand they start working according to human time-frame. And when there is no group like this then these laws go back to their own time-frame which is extremely slow compared to human time-frame. According to the Quran, Allah's one Day could be ten thousand years or even fifty thousand years. The working of these laws is such that they have a strict watch over human systems. Humans establish their systems and after some time find that it is creating chaos and trouble then they establish another revised system. This way they go through a trial and error process and each time they inch toward the divine system of the Quran. No matter how much they try on their own they are bound to adopt the divine trajectory sooner or later. And history is witness that once humans develop a better system then it always moves in the direction of the universal divine system of sustenance. Human system is bound to move toward this system by their own trial and error process because their self-created system is always chaotic and disruptive. But this process may take thousands of years or even the hundreds of thousands years. Right now the world is going through chaos and turmoil globally and is desperate to adopt a system that will be peaceful and progressiveas a whole.Let us see what kind of system the world is yearning for.

The Quranic system of government

In the Quranic system, no one – including the Prophet (PBUH) – can demand one's own obedience from any human being. The Quran makes this point absolutely clear

which serves as the essence and foundation of the Islamic system of government and the last word on this topic, and a charter of real freedom for humankind. Please listen carefully to this proclamation from Allah: مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُؤْتِيَهُ اللَّـهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّي مِن دُونِ اللَّـهِ وَلَـٰكِن كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنتُمْ تَدْرُسُونَ 3:79 –
The fundamental principle of Deen is that no human being – even though Allah may have given him a Code of Laws or the power to enforce it or even Prophethood – has the right to say to the others: "You should obey me rather than Allah." What he should say is: "You should be amongst those who belong to Allah by following His Book which you study and teach it to others."

The obedience of Allah is not just abstract and theoretical. As, it is clearly mentioned here, in the Islamic system, the obedience of Allah is to be done practically through the Book of Allah. The Quran will be the constitution of the Quranic state. All affairs of the state must be decided within the laws of the Quran (5:44, 5:45, 5:47). Human beings – whether individuals or groups – have no right of law-making. The duty of the government is to enforce Quranic laws, not make its own laws. This was the practical way that the Quran proclaimed freedom to all humankind. After the first period of Islam this system disappeared, and humans (rulers) started to make their own laws. The governance started to happen by trial-and-error approach. After centuries of experiments the world has created a system which is called secularism, the practical implementation of which is called democracy. The question is: Is this system producing good results for human beings? Let us see the answer from Western experts.

Rene Guenon, in his book entitled, "The Crisis of the Modern World," says:

"If the word 'democracy' is defined as the government of the people by themselves, it expresses an absolute impossibility and cannot even have a mere de facto existence in our time any more than in any other… The great ability of those who are in control in the modern world lies in making the people believe that they are governing themselves, and the people are the more inclined to believe this as they are flattered by it and as they are in any case, incapable of sufficient reflection to see its impossibility. It was to create this illusion that 'universal suffrage' was invented."

Professor Alan Gewirth of the University of Chicago has said about democratic system that the word "public" or "people" are no more than fiction. In this system only influential parties exist which fight with each for power. From this point of view, the idea of democracy is the invention of the enthusiastic power of speech in which words of truth, morality, and good action are tricks carrying which these parties descend into the political battlefield and media marketplace.

The second assumption of the idea of democracy is that the government is formed by people's consent and thus its obedience becomes incumbent on the people; and that a democratic government that is formed by the majority party is therefore not a dictatorship because it exists at the pleasure of the people. Professor Gewirth says that this is also fiction. He says that those who voted for the minority party or didn't

vote at all are forced to follow the majority party rule. So, their obedience cannot be called their consent.

French philosopher Bertrand de Jouvenel says that once man's will is assigned absolute power, then it does not matter whether it is the rule of majority or of a single person, the result is essentially the same in spirit. Those at the helm exercise absolute uncontrolled power.

University of Michigan Professor William K. Frankena says that: Decisions made according to the laws of a state are called justice. But if the laws of the state are themselves not based on justice, then how could the public decisions delivered based on those laws be called social justice?

This raised the question that if state laws cannot be called just then what should be standard to test just and unjust? Professor Frankena then provides the answer by Professor Lewis who says that just is always just under all conditions and equal for every individual. The basic condition of just is that it must be universal and it also must be eternal. He refers to Tennyson who says if eternity is removed from virtue, truth, and justice then these become heap of ash. Then he refers to Emil Brunner who says that for measuring what is just and what is unjust, there must be an objective standard by which one can test just and unjust things; and this objective standard should be beyond all human laws and customs. This needs to be accepted that there exists a universal absolute divine standard for justice. Otherwise, justice will become individualized; that to one something may be justice and to the other it would be unacceptable. The absolute truth must be tested on a universal objective divine standard. otherwise, it will be human-crafted jewelry that shines but is fake.

Another famous thinker Ernest Barker says that there is a higher law that is real and natural law on top of the state's constitutional law. We can call this higher law as "natural" law that is in conformity with human nature. This law is true and just in its very essence. This law is universal and eternal. This law existed during Aristotle's time – in fact, it has been existing since the very beginning. Aristotle said that the power of this natural law is universal and eternal and its source is beyond human mind to grasp. Baker emphasizes Blackstone's assertion that obedience of nature supersedes every worldly obedience.

American Professor Edward Corwin in his book entitled, "The Higher Law", mentions that man-made laws must be based on principles and values that are not dependent on place and time. He says that the idea that the American constitution represents the popular will of the people is a later innovation. Originally it was based on universal and eternal idea of unchangeable justice and human "will" had relatively less role in it. This idea was opposite of the current idea of law. The previous constitution was based on the idea that truth and justice are ruling the universe. Therefore, the universal truth and the universal justice must dominate human rule irrespective of the fact that what those in power and authority think about it, because these universal principles are not the product of humans. These universal

principles provide a concept of God that controls them and keeps them in balance. These principles are objective and present in the external universe and are eternal and unchangeable. Then he mentions the unforgettable arguments of Cicero in its favor that true law is that which is given by nature that clearly distinguishes between truth and falsehood. Any law other than this should not be understood as law; in fact, it should not even be called "law." Barker (mentioned above) goes on to say that this is the kind of law that should be obeyed. He says that the state exists only to enforce these universal permanent values; if it doesn't then one should not obey its law, because loyalty to a state could only be demanded if its laws enforce universal permanent values. He says further that political obedience is conditional, not absolute. This obedience is not necessary under all conditions. It is only to be done until it does not clash or violate any permanent value.

Did you notice my friends what kind of laws the thinkers of the West are searching for when they clearly see that the humans are suffering under the democratic political system? They are looking for universal permanent and eternal laws whose source is beyond human thought. But, it is unfortunate that these Western thinkers didn't know where to find a document of natural law applicable to human world.

Nationalism

The Quran declared 1400 years ago: كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً (2:213) – All humankind is one single community. Therefore, to divide humanity into nations, or tribes;or divide humans based on language, ethnicity, or race is tantamount to creating hell on earth. The Prophet (PBUH) established a system byknocking out all these difference and created one single community.He created one single brotherhood of humankind (49:10). The result was heaven on earth as along as the Prophet's system lasted. Then Muslims deviated from the Prophet's (PBUH) path and got submerged into nationalism. The result? The tyranny, strife, war, and human suffering. Because of the turmoil and chaos created by nationalism, Western thinkers have started crying.

Let us see what Murray thinks of nationalism:

The religion of nationalism is diabolical. Whether it possesses Germans, Russians, Japanese, Americans or Englishmen, it appears as the supreme exaltation of the Selfhood – the religion of Satan, the Prince of this world. To it today all large-scale religions arc sub- servient. Christianity in all its forms – except that professed by the small minority which repudiates Nationalism – is submerged in the satanic religion of Nationalism. Therefore, religion on the grand scale can provide no escape from our misery. As veritable and universal religion, commanding an allegiance that overrides the claims of Nationalism, it does not exist. In its tacit and unholy combination with Nationalism, it sanctifies the chief cause of our misery. If religion is essential for our salvation it must, first, be a religion which compelsfrom the person an allegiance which completely overrides the claims of Nationalism; and secondly it must be a religion which enlarges and strengthens man's capacity to act as an individual. [J. M. Murray, Adam And Eve, p. 66.]

Emery Reves is rather pessimistic about it:

We have played long enough with the toy of inter-nationalism. The problem we are facing is not a problem between nationalisms. It is a problem of a crisis in human society, caused by nationalism, and which consequently nationalism or internationalism can never solve. [Emery Reves, The Anatomy of Peace, p. 164]

What is needed is universalism. A creed and a movement for creating a system of values which transcends the nation-state structure. Reves goes on to say:

To put it bluntly, the meaning of the crisis of the twentieth century is that this planet must to some degree be brought under unified control. Our task, our duty, is to attempt to institute this unified control in a democratic way, by first proclaiming its principles and to achieve it by persuasion and with the least possible bloodshed. If we fail to accomplish this, we can be certain that the iron law of history will compel us to wage more and more wars with more and more powerful weapons against more and more powerful groups, until unified control is finally attained through conquest.[Emery Reves, The Anatomy of Peace, p. 233]

The political organization proposed by Reves, as the only solution to the problem which confronts the world, is not dissimilar to the Islamic Social Order. We quote from another political thinker, F. Hertz, whose views will be found to be of great interest:

It is now generally recognised that a mere machinery of international organisation cannot work if the right spirit is lacking. But how can this spirit be created or strengthened. The proclamation of general principles obviously is not enough. Neither is it sufficient to lay downthat nations must be educated towards that spirit, if a practicable plan and an adequate number of qualified educators are not available. The habit of treating such questions in an unrealistic and perfunctory way is bound to lead to failure, disillusionment and cynicism. Education towards world citizenship, moreover is not merely a matter for the schools. It is connected with all the great issues of political and economic life and could only be solved if the political nations of the world would adopt detailed plans based on identical principles.[F. Hertz, Nationality in History and Politics, p. 413]

Prof. Cobban has expressed the same view:

The solution to which we are apparently forced is the creation of a World state. [Alfred Cobban, op. cit., p. 225]

Laski appealed for the establishment of "a universal social order which shall be composed of members hailing from the four corners of the earth."[Harold Laski, Human Rights, p. 91]

W.A. Gould is thinking on the same lines as the following quotation shows:

That our primary concern should be for 'home and country' is natural and proper but we cannot escape the implications of membership in world society. [W. A. Gould, Man, Nature and Time, p. 281].

TO BE CONTINUED

4- وہ دائرہ اسلام سے باہر چوٹی کے حکماء اور فُضلاء کو ذہن میں رکھیں کیونکہ یہی لوگ ہیں جن کے قائل ہونے سے دنیا کی ذہنی فضا سے باطل تصورات کا اثر زائل کیا جا سکتا ہے۔

5- وہ علمی دنیا کے مسلمہ حقائق سے آغاز کر کے ان قرآنی حقائق کی طرف آئیں جن کی صحت لوگوں کے نزدیک مسلم نہیں۔

6- کسی غلط عقیدہ کی محض نفی مخالفین کو قائل نہیں کر سکتی جب تک اس کے مقابل کے صحیح تصور کا اثبات نہ کیا جائے۔

7- وہ ایک فلسفہ یا ایک فلسفیانہ خیال کی تردید کے لئے جن تصورات کو صحیح سمجھ کر کام میں لائیں تو کسی دوسرے فلسفہ یا فلسفیانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے اسے غلط قرار نہ دیں۔ بلکہ اپنے موقف پر قائم رہیں۔

8- مغرب کے صحیح تصورات کو نہ تو رد کریں اور نہ ہی ان کے غلط تصورات کو قبول کریں۔

9- ہر غلط فلسفہ کے اندر وہ جن تصورات کو صحیح سمجھیں انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے غلط قرار نہ دیں اور جن تصورات کو غلط سمجھیں، انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے صحیح قرار نہ دیں ورنہ وہ اپنی تردید خود کریں گے۔

(3) ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا موقف:

1- کسی علمی صداقت کے ساتھ متصادم نہ ہو بلکہ ہر زمانہ میں تمام علمی صداقتوں کے ساتھ پوری طرح سے ہم نوا اور ہم آہنگ رہے اور جوں جوں علمی صداقتیں منکشف ہوں وہ اس کے اندر سماتی چلی جائیں۔

2- جس کے تمام تصورات ایک دوسرے کے ساتھ عقلی ربط وضبط رکھتے ہوں اور ایک دوسرے کی عقلی تائید اور توثیق کرتے ہوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب اس کے تمام تصورات قرآن کے بنیادی تصور کے ساتھ عقلی طور پر متعلق ہوں۔

3- جو تمام باطل فلسفوں کی موثر تردید کرتی ہو۔

4- جو کائنات کا ایک مکمل فلسفہ ہو اور حقیقتِ انسان و کائنات کے اہم مسائل کے بارے میں عملی راہ نمائی کرتی اور صداقت اور سچائی کا راستہ بتاتی ہو۔

5- جو علمی تصورات کی خامیوں کو آشکار کر کے انہیں پاکیزہ اور سُستہ بناتی ہو۔

6- جو ہمیں احکامِ دین کی حکمتوں اور علتوں کے پورے سلسلہ سے آگاہ کرتی ہو اور ان حکمتوں اور علتوں کا ایک ایسا تصور دیتی ہو، جس میں اندرونی طور پر کوئی تضاد نہ ہو۔



(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)



PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.74
ISSUE
09

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
Web: www.toluislam.org www.facebook.com/talueislam/

